غبارِ کارواں

''کاروان ادب اسلامی'' کے اداریے
اور دیگر رشحاتِ قلم

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

رابطہ ادب اسلامی، لکھنؤ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

سلسلۂ مطبوعات
۳۶۴

بار سوم

اکتوبر ۲۰۱۷ء---محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

نام کتاب	:	غبار کارواں
نام مصنف	:	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۲۳۴
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	۱۹۰/روپے
باہتمام	:	محمد کلام الدین ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

ندوہ کیمپس ندوۃ العلماء لکھنؤ

فون:0522-2741539

Email:info@airp.org.in

airpnadwa@gmail.com

فہرست عناوین

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	۵
۲	عرض مصنف	۱۳
۳	رابطہ ادب اسلامی کا قیام	۱۷
۴	ادب اور زبان	۳۳
۵	ادب اسلامی کا تخیل و محرکات	۳۷
۶	اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات	۴۳
۷	اسلامی ادب	۴۸
۸	ادب اسلامی کیوں؟	۶۳
۹	اسلامی ادب جامع ترین ادب	۶۸
۱۰	زبان اور ادب اور ان کا صحیح مفہوم	۷۲
۱۱	الفاظ جب اثر رکھتے ہیں	۸۰
۱۲	کلام میں اندرونی کیفیت اور اس کی رعایت کا اثر	۸۴
۱۳	ادب کی طاقت	۹۸
۱۴	ادب اور زندگی	۱۰۱
۱۵	تاریخ اور ادب (۱)	۱۱۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۶	تاریخ اور ادب (۲)	۱۱۸
۱۷	تاریخ اور ادب (۳)	۱۲۱
۱۸	زبان وادب کا تعلق ثقافت و مذہب سے	۱۲۳
۱۹	حمد ودعاء ومناجات کی ادبیت	۱۲۷
۲۰	سفر کا تذکرہ قرآن مجید کی زبان میں	۱۴۹
۲۱	حدیث شریف کا ادبی امتیاز	۱۵۹
۲۲	سوانحی ادب ایک دلنواز ادب	۱۶۵
۲۳	ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں	۱۶۹
۲۴	اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ	۱۷۳
۲۵	تحریک آزادی واصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ	۱۷۸
۲۶	خطوط اور تأثراتی خاکے	۱۸۱
۲۷	بچوں کا ادب	۱۸۴
۲۸	اسلامی بیداری میں علامہ شبلی نعمانی کا حصہ "الفاروق" کے تناظر میں	۱۹۱
۲۹	اقبال کا مرد مومن	۲۰۰
۳۰	اردو سے ہندوستانی مسلمانوں کا ثقافتی وادبی رشتہ	۲۰۵
۳۱	اردو زبان سے بے توجہی ملک وملت کا بڑا نقصان	۲۰۹
۳۲	ارض القرآن ایک بڑا علمی کارنامہ	۲۱۳
۳۳	صحافت عصر حاضر میں	۲۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

جناب مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب کی اس کتاب پر مقدمہ لکھنا میرے لئے حدی خوانی نہیں ہے کیونکہ نہ محمل گراں بار ہے نہ کارواں کی رفتار میں کوئی کمی ہے، یہ تو منزل بہ منزل رواں ہے۔ اسلامی ادب کے اس قافلہ کے سالار خود مولانا ہیں، جنھوں نے راہ بھی متعین کی ہے، رہبری بھی کر رہے ہیں۔ اور قافلہ کا انتظام اور انصرام بھی۔ یہ قافلہ نو بہار بقول مصحفی جرس غنچہ کی صدا پر چلا جا رہا ہے۔ ہر منزل پر رکتا ہے اور مسافر آ ملتے ہیں۔ اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، کوئی آخری منزل نہیں۔ بقول امریکہ کے معروف شاعر رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) کے ابھی مجھے بہت دور جانا ہے۔

اس حقیر مقدمہ نگار نے کبھی کاروان زندگی کے لئے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت مولانا علی میاںؒ اور مولانا رابع صاحب کو آسمان علم و ادب کے آفتاب و مہتاب سے تشبیہ دی تھی، آفتاب تو غروب ہو گیا، علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ بطن گیتی سے ایسا آفتاب اب نہیں پیدا ہو گا لیکن یہ ماہتاب اپنی ٹھنڈی اور آنکھوں کو تراوٹ پہنچانے والی روشنی بکھیر رہا ہے

یہ روشنیِ علم و عمل ہے، مولانا کی وہ کتابیں جو عربی میں نہ لکھی ہوں میں نے سب پڑھی ہیں۔ گو یہ نتیجہ کبھی نہیں نکال پایا کہ خوب سے خوب تر کون ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ، یہ ضیاباری ایسے ہی قائم و دائم رہے۔

مضامین کا یہ مجموعہ دھنک کے خوب صورت رنگوں کی طرح ہے۔ الگ الگ مگر جن کا حسن سب کے ایک ساتھ ہونے میں ہے۔ علم طبعیات کا ایک مبتدی بھی یہ جانتا ہے کہ یہ سارے رنگ ایک سفید رنگ سے بنتے ہیں۔ جس کو بادلوں کی مختلف تہیں منتشر کر دیتی ہیں۔ مولانا کے لئے یہ سفید رنگ اپنے دین کی حقانیت پر پورا اعتماد۔ اپنے رسول سے بے پناہ محبت، اسلام کے ماضی اور حال پر گہری نظر اور ایک گداز دل کے مالک ہونے کی علامت ہے۔ اس کتاب کے مضامین احساسات کو چھوتے ہیں۔ افکار اور حقیقتوں کا بیان ضرور ہے مگر طرز انشاء اتنا دلکش اور رعنائی سے بھرپور ہوتا ہے کہ مولانا جو کچھ کہتے ہیں وہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ مضامین کی اونچی علمی سطح پڑھنے والے کو مرعوب کرنیکے بجائے متاثر کرتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ بقول غالب "یہ تحریر کی لذت ہے"۔

مولانا پرجوش عبارت اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں بالکل سادہ عبارت لکھتے ہیں جسے شاعری کی زبان میں سہل ممتنع کہیں گے، نفس مضمون اتنا سنجیدہ اور علمی اور بیان اتنا سادہ اور پرکار، یہ ہر لکھنے والے کے بس کی بات نہیں۔ میر کا شعر ان مضامین پر پوری طرح صادق ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

کتاب کے موضوعات الگ الگ ہیں مگر سب میں ایک ربط فکری

ہے۔ مضمون نگار کے باطنی تقاضے اور فکری زاویے انداز بیان سے بڑی آسانی سے پڑھنے والے تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مقدمہ نگار اپنی محدود عقل اور محدود علم سے سارے مضامین کا احاطہ نہیں کرسکتا اور نہ مکمل خوبیوں کو اجاگر کرسکتا ہے لیکن اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی وضاحت کے لئے نمونے پیش کرے گا۔ آپ روانی بیان کا اعجاز دیکھیں گے۔ ہر بات میں ایک نئی تب وتاب ہے۔ بجلی کی ایک رو ہے جو دل کو مرتعش ضرور کرتی ہے۔ مگر سکون کا احساس بھی دیتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک دم ماضی کے دھندلے نقوش صاف ہورہے ہیں۔ علم جو ہمارا گمشدہ مال تھا ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں اور پارہے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے مولانا کے کارواں کی کوئی منزل آخری نہیں ہے۔ مولانا کے مزاج کی مثال میں گوئٹے کے فاؤسٹ سے دوں گا جس نے کہا تھا کہ ''میں کسی لمحہ سے نہیں کہونگا ذرا رک جا، تو کتنا پیارا ہے۔''

اپنے مضامین میں مولانا نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی نفسیات کا پورا خیال رکھا ہے۔ مولانا کے مآخذ قدیم اور جدید دونوں ہیں۔ جن حالات اور جن واقعات کو وہ بیان کرتے ہیں ان کے منطقی نتیجوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ہر مضمون میں ایک حسن تکمیل ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون رابطہ ادب اسلامی کا قیام ہے۔ اس مضمون میں مولانا نے دکھایا ہے کہ اسلام اور ادب۔ مذہب اور ادب بے جوڑ چیزیں نہیں ہیں اردو حلقوں میں اسلام مخالف خطرات سے مقابلہ نہیں رہا ہے کیونکہ اردو کے لکھنے والے پرانے ادیب مذہبی مزاج کے مذہبی علم رکھنے والے رہے ہیں اور معاشرہ بھی مذہب کے زیر اثر رہا ہے مگر دوسرے ملکوں میں یہ صورت حال نہ تھی۔ حضرت مولانا علی میاںؒ نے جب اپنا مضمون دمشق کے

موقر ترین ادارہ میں پیش کیا تو اسے بہت سراہا گیا۔ اسلامی ذہن کے عرب ادباء نے رہنمائی کی درخواست کی اور موجودہ تنظیم رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ اس رابطہ نے اصول وضوابط طے کئے اور اسلام کے موقف کو واضح کرنے کی ہدایت اپنے تعلق رکھنے والے اسکالرس کو دی۔ مولانا کا یہ مضمون بے حد مفصل مربوط اور ادب کے مزاج کے مطابق ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کے بعد کے مضامین ادب اسلامی کا تخیل ومحرکات اور ان کا صحیح مفہوم اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات۔ ایسے مضامین ہیں جو وہی لکھ سکتا ہے جس کا علم بھرپور اور دماغ روشن ہو۔ کتاب کے مصنف اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ایسے علمی مضامین جو مثالوں سے بھرپور ہوں بہت کم لوگ لکھ سکتے ہیں۔

مولانا کا قلم چلتا ہی گیا ہے۔ اسلامی ادب کا جامع ترین ادب ہونا، اردو سے ہندوستانی مسلمانوں کا ثقافتی رشتہ ادبی اور فنی خصوصیت کے ساتھ معلومات سے بھرپور ہے۔

مولانا نے اپنے ایک دوسرے مضمون حمد ومناجات کی ادبیت میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے اپنے رب کے حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مناجاتوں اور دعاؤں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ طائف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ سے فریاد۔ بدر کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور اسی طرح کے ادب کے شہ پارے سامنے لائے ہیں۔ یہ بہت زیادہ ہیں لیکن تھوڑی مقدار میں لکھ کر مولانا نے دعا کی ہے کہ اے اللہ ہمیں اپنی فرمانبرداری اور رسول کی اطاعت کی توفیق نصیب فرما۔ بے حد دل کو چھونے والا مضمون ہے۔

حدیث شریف کی ادبی اور فنی خصوصیات کی ابتدا مولانا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات کے اظہار جو صاحبزادہ ابراہیم کی وفات پر کیے ہیں، سے کی ہے۔ دل اپنے سرکار کے غم اور صبر و رضا پر رونے لگتا ہے۔ دل رنجیدہ ہے۔ آنکھ میں آنسو آرہے ہیں لیکن ہم وہی کہتے ہیں جس سے رب راضی ہو۔ ہم تمہاری جدائی سے اے ابراہیم رنجیدہ ہیں۔

اس مضمون میں مناجاتوں اور دعاؤں کے ساتھ قابل قدر اشخاص کے ساتھ محبت و تعلق کے بلیغ جملے ہیں۔ اس مضمون کا پڑھنا ایمان کی تازگی کا باعث ہے۔

حضرت مولانا نے تاریخ اور ادب پر ایک بے حد طاقتور مضمون لکھا ہے یہ مضمون تین الگ الگ حصوں میں ہے۔ شعراء کے مارے مارے پھرنے اور جو کہتے ہیں اس پر عمل نہ کرنے پر کلام پاک کا تبصرہ ہے۔ یہ مضمون بے حد بلیغ ہے لیکن چھوٹا ہے شائد مولانا نے، اختصار بلاغت کی جان ہے، پر عمل کیا ہے۔

مولانا کے مضامین کا یہ سلسلہ سلسلۃ الذہب ہے۔ میں نے اپنی تمہید میں لکھا ہے کہ مولانا نے اپنے مضامین کے لئے عام فہم زبان چنی ہے۔ سوانحی ادب، ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینہ میں۔ زبان و ادب کا تعلق ثقافت اور مذہب سے، الفاظ عجیب اثر رکھتے ہیں۔ اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ، چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں مگر معلومات کے ساتھ بہترین انشاء کا مذاق رکھتے ہیں۔ اور قاری کا دل خوش کر دیتے ہیں۔

مولانا کا قلم چلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سفر نامہ کا تذکرہ قرآن مجید کی زبان میں معلومات سے بھرپور ہے۔ اس مضمون کی جان اس سفر کا بیان ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ کے ساتھ کیا ہے جس کے لئے

اقبالؔ نے اپنا مشہور شعر لکھا ہے

کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

چھوٹے چھوٹے مضامین کے بعد پھر ایک بڑا مضمون آتا ہے اور وہ ہے کلام میں اندرونی کیفیت اور اس کی رعایت کا اثر۔ یہ بڑا ہی شاندار مضمون ہے کلام پاک سے مولانا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مختلف موقعوں پر فرعون سے گفتگو پر اپنا تبصرہ لکھا ہے اور حدیث سے انھوں نے وہ چھوٹی سی تقریر چنی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے بعد انصار کے سامنے کی ہے بے حد اثر ڈالنے والی تقریر ہے جس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے۔

اے گروہ انصار! کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھر جائیں اور تمہارے ساتھ اللہ کا رسولؐ ہو جسے لے کر تم اپنے گھروں کو لوٹو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے تم جو چیز لے کر لوٹو گے وہ اس چیز سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ اپنے گھر لے جائیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب افصح العرب والعجم ہے۔ یہ تقریر اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ پھر مولانا نے بچوں کے ادب پر خامہ فرسائی کی ہے یہ معلوماتی ہے اور یہاں مولانا نے اپنے جذبہ اور تخیل کا استعمال کم کیا ہے۔

پھر مولانا الفاروق پر آئے ہیں اور مولانا شبلیؒ کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا نے اس مضمون میں اپنے کو تھوڑا سا ایک ہی کتاب میں محدود کر لیا ہے گو دوسری کتابیں بھی بطور امتثال آئی ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر تھوڑی سی

تشنگی رہتی ہے۔

اب مولانا ارض القرآن پر آتے ہیں۔علامہ سید سلیمان ندوی کی یہ کتاب اعلیٰ ریسرچ کا بہترین نمونہ ہے۔مولانا نے بے حد دلچسپی سے اس کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔شائد مولانا کی علم جغرافیہ کی وابستگی نے مصنف کے اس عالی شان کام پر مضمون لکھنے کے لئے مہمیز کا کام کیا ہے۔مضمون غالب کے اس مصرعہ کا مصداق ہے۔''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔'' مولانا نے ایسے معلومات کی نشان دہی کی ہے جن پر حجاز کے مقامی معلومات اور قرآن مجید اور حدیث شریف میں آنے والے متعدد علاقائی اشاروں کی تحقیق کا انتظام نہیں ہوا تھا۔مولانا نے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب قرآنی جغرافیہ پر ایک عظیم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا رابع صاحب کا جو مخصوص طرز انشاء ہے اس نے ہر مضمون کو جاذب نظر بنا دیا ہے دماغ اور دل دونوں کی راحت کا باعث ہوتا ہے۔جہاں معلومات چن کر ایک کشتی میں رکھ کر پیش کئے ہیں وہاں کشتی بھی حسن کا ایک نمونہ ہے،مولانا کی جو شخصیت ہے اس کا آئینہ دار یہ شعر ہے:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی مولانا کی کتابوں اور مضامین پر بھی منطبق ہوتا ہے۔اس شعر کا اردو ترجمہ میر نے کیا ہے اور بہترین کیا ہے۔

جس جائے سراپا پر نظر پڑتی ہے اس کے
آتا ہے میرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

اپنے اس مجموعہ میں مولانا نے اقبال کے مرد مومن کا بھی تعارف کرایا

ہے اور سب سے آخر میں صحافت کی تاریخ اور عصر حاضر میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، یہ مقدمہ کتاب کی ضخامت کی مناسبت سے طویل ہوتا جارہا ہے مگر داخلی حسن کی مناسبت سے نہیں۔ انکسار کے خلاف نہ ہو تو سعدیؒ کا مصرعہ لکھوں

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں

اب اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

وصی احمد صدیقی
لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مصنف

رابطہ ادب اسلامی کا قیام ۱۹۸۴ء میں باقاعدہ ایک عالمی انجمن کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عمل میں آیا، مجھے بھی اس کی کچھ خدمت کا موقع ملا، جو میرے لئے عزت اور مسرت کا باعث ہے، رابطہ کے قیام کے بعد اسکے تحت مختلف ادبی و علمی اجتماعات منعقد کئے گئے اور انجمن کی طرف سے اس کے مختلف مرکزوں سے رسالے اور کتابچے بھی شائع کئے گئے، ان ہی میں اس کے مرکزی دفتر واقع لکھنؤ سے شائع ہونے والا اردو کا ایک سہ ماہی ترجمان کاروان ادب اسلامی بھی ہے جو آٹھ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ادب اسلامی کے سلسلہ میں ہر سال ایک بڑا مذاکرہ علمی بھی منعقد کیا جاتا ہے۔

ان دونوں ذریعوں سے اسلامی ادب کے تعارف و خدمت کا مفید کام انجام پا رہا ہے، رابطہ ادب کے اس کام میں مجھے بھی شرکت بلکہ اس کے اہتمام کی سعادت حاصل ہوتی رہی ہے اور اسی ضمن میں مجھے اس کے ذریعہ کچھ نہ کچھ پیش کرنے کا موقع بھی ملتا رہا ہے۔ ان پیشکشوں میں ادب

اسلامی کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ، اسلامی ادب کے بعض زریں نمونے رابطہ ادب اسلامی کا تعارف شامل ہے۔ ان کے ذریعہ انجمن رابطہ ادب اسلامی کے کام کی رفتار کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا ایک انتخاب ادب اسلامی سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا جائے، اس انتخاب میں دو مضامین رابطہ ادب اسلامی کے دائرے سے باہر کے بھی ہیں جو موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ تحریریں رسالہ کی فائلوں میں دبی رہنے کے بجائے کتابی شکل میں منظر عام پر آجائیں گی۔ امید ہے کہ ادب اسلامی کی خدمت کے ضمن میں یہ بات مناسب ہوگی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قبول فرمائے اور نافع بنائے۔

ادب اسلامی کے عنوان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فکر و خیال ابھارا اور اس کو عملی شکل میں پیش کر کے واضح کیا اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہمارے علمی و ثقافتی و دینی ورثہ میں اسلامی تخیل ادب کے مطابق کافی سرمایہ ہے جو موضوع کے علمی و دینی ہونے کے باعث اپنی طرف ذہنوں کو متوجہ نہیں کر رہا ہے اس کو نکالنا اور پیش کرنا چاہئے نیز اپنی ادبی کوششوں میں اس سے مدد لینا چاہئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس نقطۂ نظر کے صرف اظہار پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے اس کی عملی مثال بھی پیش کی اور اس طرح اسکی راہ کشادہ کرتے ہوئے اس کو ایک جادۂ کارواں بنا دیا، اس عمل نے عرب ادباء کو خاص طور پر متاثر کیا اور وہ مولانا کے ساتھ شریک قافلہ بنے اور اس طرح رابطہ ادب اسلامی کی عالمی انجمن وجود میں آئی اس کے کاروان عمل نے ۱۹۸۶ء کے آغاز سے ندوۃ العلماء

میں ادب اسلامی پر منعقد کیے جانے والے سیمنار سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور الحمدللہ اس وقت سے وہ برابر سرگرم عمل ہے، ادب اسلامی کے نئے نئے پہلوؤں پر سیمنار بھی منعقد ہوتے ہیں اور سہ ماہی آرگن میں اسی دائرے کے مضامین اور کاوشیں بھی پیش کی جاتی ہیں اس کاروان کے جلو میں چلنے والوں کی ہماہمی نے ادب اسلامی کے خط وخال نمایاں کئے اور ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی نگارشات پیش کیں جو اسکے اردو، عربی، ترکی، اور بنگلہ دیشی آرگنوں کے ذریعہ منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ ان میں اس راقم کا بھی کچھ حصہ رسدی ہے جس کی کسی قدر نمائندگی زیر نظر مجموعۂ مضامین میں بھی ہے۔ ان مضامین میں مشترک بات ان کا ادب اسلامی اور رابطہ ادب اسلامی سے تعلق ہے، یہ اصطلاحی لحاظ سے شاید ادب کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن یہ تذکرہ وتبصرہ ادب کا فرض انجام دیتا ہے، انداز بیان موضوع کے پہلوؤں کے فرق کی رعایت کا ہے اور کہیں موثر مثالوں کو پیش کرتے ہوئے ان کی دل آویزی کا بھی ہے، امید ہے کہ قارئین کو رابطہ ادب اسلامی کی گرمی عمل کی ایک جھلک اس مجموعہ سے ملے گی، یہ جھلک اس راقم سطور کی کم بضاعتی کے باعث شاید دل آویز جھلک نہ محسوس ہو لیکن بہرحال اس سے سرگرم سفر کارواں کا حال سفر دیکھا جاسکتا ہے۔

ہمارے کرم فرما پروفیسر وصی احمد صدیقی رکن مجلس عاملہ رابطہ ادب اسلامی کے قلم کو ایسا ادبی اسلوب نگارش حاصل ہے جس سے وہ قطعۂ صحراء کو چمن بنا دیتے ہیں انھوں نے اپنے اسی قلم سے اس مجموعہ کیلئے مقدمہ تحریر فرمایا اس میں راقم کے اس عمل کو قدردانی اور محبت دونوں نظروں سے دیکھا اس سے اس مجموعۂ مضامین کو ایک دل آویز آغاز حاصل ہوگیا، جو اس مجموعہ

کے لیے باعث زینت ہے اور بذات خود ایک ادبی مضمون بن گیا ہے جو اس مجموعۂ مضامین کی قدر میں اضافہ کا باعث ہے، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

میں اپنے دیگر احباب و معاونین کا بھی شکر گزار ہوں جن سے اس مجموعہ کو اشاعت کے لائق بنانے میں مجھ کو مدد ملی، ان میں خاص طور پر مولوی اقبال احمد ندوی قابل ذکر ہیں جن کی خصوصی فکر و توجہ سے یہ کام آسان ہو گیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

۶/۷/۱۴۲۲ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۲۴/۹/۲۰۰۱ء — ندوۃ العلماء لکھنؤ

رابطہ ادب اسلامی کا قیام

وبہ نستعین ، ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

موجودہ عہد میں جبکہ یورپ کے ادب وثقافت نے یورپ کے استعماری اثر ونفوذ کی مدد سے پورے عالم اسلام پر اثر جمایا اس نے ادب کے اسلامی تصور کو نقصان پہونچایا، اس کے اثر کو کمزور کیا اور ادب نواز حلقوں میں اس کو مبہم ومشکوک بنادیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس نئے رجحان سے زیادہ متاثر ہوا۔ اور اس کے اثر سے پورے عالم اسلامی میں یہ تصور عام ہوا کہ اسلام اور ادب اور مذہب اور ادب دونوں میں کوئی جوڑ نہیں، اس تصور کے نتیجہ میں ادب کی وہ قدریں مشکوک ہوگئیں جن کی آبیاری اسلامی ذہن یا مذہبی تصور سے ہوتی تھی، ادب اور مذہب یا ادب اور اسلام کے مابین مغایرت کا یہ خیال عالم اسلامی کے وسیع رقبہ میں پھیلا، البتہ برصغیر کے مسلمانوں کا بڑا حصہ اس سے کم متاثر ہوا اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اردو زبان وادب کو اپنایا تھا۔ وہ اس زبان وادب کے حاملین وقائدین اور داعی تھے ان کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا وہ کسی نہ کسی حد تک یا بڑی حد تک مسلمانوں میں مشرقی اور اسلامی قدروں کا اور ان کے

تصورات کا حامی تھا۔ اس صورت میں برصغیر کے اردو حلقوں میں مشرقی اور اسلامی قدروں کو اسلام مخالف خطرات کا بہت زیادہ مقابلہ نہ تھا۔ ان حلقوں میں ادب کے صحت مند اور اسلام سے وابستہ اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے اور اس کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت بعض ملحدانہ جماعتوں یا تحریکوں کے مقابلہ میں پڑی، ورنہ عمومی دائرے میں کسی اسلامی رجحان کے دفاع یا غیر اسلامی ادب کے مقابلہ کی ضرورت نہ تھی، اس کے برعکس دوسرے ممالک میں صورت حال مختلف رہی، وہاں عام طور پر سامراجی فکر ورجحان کا اثر دانشوروں اور ادیبوں پر ذرا زیادہ پڑا جس کی وجہ سے ادب کی زندہ قیادت کا سہرا اسلامی رجحان کے لوگوں کے ہاتھوں سے بالکل نکلتا ہوا معلوم ہوا، اس صورت میں جہد وکوشش کا تقاضہ محسوس کیا گیا، اسی لئے جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس صدی کی پانچویں دہائی میں ادب کی اسلامیت کے بارے میں اپنا طاقتور مضمون ممالک عربیہ کے زبان وادب کی مؤقر ترین اکیڈمی واقع دمشق میں پیش کیا تو اس کو بہت سراہا گیا، اور اس کے اثر سے اسلامی ذہن کے عرب ادباء نے مولانا کے سامنے عملی طور پر رہنمائی کرنے اور اس کے لئے کوشش کا اجتماعی نظام بنانے کی تجویز رکھی، جس کے نتیجہ میں موجودہ ادبی تنظیم رابطۂ ادب اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ لیکن اس تشکیل سے پانچ سال قبل ۱۹۸۱ء ہی میں ابتدائی طور پر اس کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی، یہ داغ بیل ایک بڑے پیمانے پر کئے جانے والے سیمینار کے اختتام پر ڈالی گئی تھی اس سیمینار میں وسیع پیمانہ پر اندرون وبیرون ملک کے اسلامی النظر ادباء وفضلاء بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے، تین روزہ ادب اسلامی کے سیمینار میں

درجنوں مقالات پیش کئے گئے، اور مذاکرہ ہوا تھا۔ رابطۂ ادب اسلامی نے اپنے مذکورہ بالا اصول وضوابط کے مطابق سرگرم کام شروع کیا، سہولت کے لئے مرکزی دفتر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، بلاد شرقیہ کے لئے لکھنؤ میں۔ دوسرا بلاد عربیہ کے لئے ریاض میں۔ اس وقت سے دونوں دفاتر اپنے فرائض بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔

رابطۂ ادب اسلامی کی یہ انجمن کسی ایک علاقہ، ملک یا اس کی کسی ایک زبان میں محدود نہیں رکھی گئی، برصغیر میں ادب اسلامی کے لئے پہلے سے جو کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کے لئے جو ادارے کام کر رہے ہیں۔ رابطۂ ادب اسلامی اس کو نظر انداز کرنے یا ان کے بالمقابل کوئی نیا منصوبہ چلانے کے لئے قائم نہیں ہوا، وہ ان کوششوں کی حق تلفی یا ان کی ناقدری کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

رابطہ کا قیام دراصل ایک ایسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی مختلف زبانوں اور علاقوں سے ہے، بلکہ اس کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، ہندوستان کی حد تک اسلامی ادب نئی بات نہ تھی، یہاں اس کے کام پر عرصہ سے توجہ دی جا رہی ہے، اور اس سلسلے میں سابق اور حال میں جو کوششیں کی جاتی رہی ہیں وہ بہت قدر دانی کے لائق ہیں، اور ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے مقصد کے عین مطابق ہیں، اور ہمارے کام کو ان سے ہم آہنگی بھی حاصل ہے، لیکن ان کی کوششوں نے بڑی حد تک برصغیر کی زبانوں تک اپنے کو محدود رکھا، اور اسی پر توجہ دی، دوسری بات یہ کہ کسی حد تک کسی خاص طبقہ تک محدود رہی، اس کی وجہ سے میدان عمل محدود رہا، ہماری کوشش یہ ہے کہ جاری شدہ کام کی قدر کرتے ہوئے ہم ان علاقوں

اور زبانوں کو بھی اپنا میدان بنائیں جو چھوٹے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ہماری یہ بھی کوشش ہے کہ ہم جماعتی و مسلکی دائروں کے مابین حساسیت سے بچتے ہوئے یہ کام کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے، توفیق اور کامیابی دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

رابطۂ ادب اسلامی کی انجمن نے اپنی جدوجہد کے لئے سردست تین میدانوں کو اختیار کیا ہے، ان میں سے ایک اسلامی ادب کے تعارف و تشریح کا میدان، دوسرے اسلامی رجحان رکھنے والے ادب کی کوششوں کو تقویت پہنچانے اور قابل تحمل حد تک ان کے ساتھ تعاون کرنے کا میدان، تیسرے اسلامی ادب کے ذخیرہ میں نئے اضافے کرنے کا میدان ہے۔

ان میں سے پہلے میدان کا کام تعارفی لٹریچر تیار کرنا، ملاقاتوں اور اجتماعات کے ذریعہ اسلامی ادب کی طرف عمومی رجحان بڑھانا وہ خصوصی کام رہے جن کو مختلف طریقوں سے حسب استطاعت انجام دیا جاتا رہا، دوسرے میدان عمل میں رابطہ کی انجمن نے اپنی استطاعت کے مطابق اسلامی ادب کے کاموں اور ترجمانوں کے ساتھ تعاون کا خاصا کام انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں انعامی مقابلے اور ادب اسلامی پر کام کرنے والوں کی اخلاقی اور بعض حدود میں مالی مدد قابل ذکر ہے، مثلاً رابطۂ ادب اسلامی کی طرف سے اسلامی افسانوں کے مقابلے کا انعقاد، جس کو رابطہ کے عربی مرکز نے انجام دیا، اور اس میں کامیاب افسانوں پر وقیع انعامات دیئے، اور مصر کے مشہور اسلامی افسانہ نگار نجیب کیلانی کو ان کے کام کی ہمت افزائی کے طور پر تمغۂ امتیاز دیا۔

انجمن کے تیسرے اختیار کردہ میدان میں قابل ذکر کام رابطہ کی

طرف سے منعقد کئے ہوئے مذاکرات علمی ہیں جو رابطہ نے نئے نئے عنوانات پر سال بسال کئے، یہ مقالات رابطہ کے ترجمان کاروان ادب میں شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں، چنانچہ اس کے نتیجہ میں مقالات کا اچھا ذخیرہ تیار ہو گیا۔

ادب اسلامی کا تصور دراصل نیا نہیں ہے، اسلام کے آنے سے ہی اس ادب کی داغ بیل پڑ گئی تھی، اس کے لئے راہ عمل کا تعین قرآن مجید اور حدیث شریف میں دی ہوئی رہنمائی سے ہو گیا تھا، صالح مقاصد اور صالح طرز حیات کے داعی حضرات اس کو بروئے کار لا رہے تھے، لیکن ادب اسلامی کی اصطلاح اس وقت سے استعمال ہونا شروع ہوئی، جب مغربی تمدن نے صالح قدروں کے لئے چیلنج پیدا کر دیا، اور ادب کو مذہب بیزاری اور خالص مادی مصالح و مقاصد کے دائرے میں محدود بنا دیا، اس کے مقابلے کے لئے صالح قدروں کے داعی حضرات اٹھے اور انھوں نے کوششیں کیں۔

ہندوستان میں اس موقع پر ادب اردو کا رواج ہو رہا تھا، اور اس کی باگ ڈور اہل دین حضرات کے ہاتھوں میں تھی، اس لئے یہاں زیادہ چیلنج کا سامنا نہ تھا، آہستہ آہستہ بعد میں کچھ ہوا جس کا مقابلہ یہیں کے حاملین اہل ادب نے شروع کیا جن کی کوششوں سے صالح ادب کے اچھے نمونے سامنے آئے لیکن بیرونی ممالک اور خود بلاد عربیہ میں یہ فتنہ زور کے ساتھ سامنے آیا، اس کو جن لوگوں نے محسوس کیا ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نمایاں مقام رکھتے ہیں، انھوں نے اس نقطۂ نظر کے مطابق کتاب "مختارات من أدب العرب" مرتب کی، پھر جب وہ دمشق کی

موقر علمی وادبی انجمن کے رکن منتخب ہوئے تو انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ اسلامی دائرے میں ادب کا جو ذخیرہ ہے اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے، اور ادب کے اسلام سے تعلق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

پھر مولاناؒ کی رہنمائی میں ندوۃ العلماء نے اس موضوع پر پہلا عالمی سیمینار ۱۹۸۱ء میں منعقد کیا، جس میں دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں سے خاص طور پر بلاد عربیہ کی یونیورسٹیوں، اور علمی وادبی اداروں اور مرکزوں سے بڑی تعداد شریک ہوئی، اور یہ سیمینار نہ صرف یہ کہ مؤقر طریقہ سے منعقد ہوا بلکہ دوسروں کے لئے نمونہ بنا، چنانچہ اس کے بعد عالم اسلامی کی کئی یونیورسٹیوں میں ادب اسلامی پر سیمینار منعقد ہوئے، ندوۃ العلماء میں منعقد کئے گئے مذاکرہ علمی میں عربی مقالوں کے لئے علاحدہ نشستیں ہوئیں اور اردو ودیگر زبانوں کے لیے نشستیں علاحدہ منعقد کی گئیں۔

اس مذاکرہ کے اختتام پر درج ذیل تجاویز کا اعلان ہوا تھا، تجاویز مرتب کرنے والوں میں چار بیرونی ممالک کے اور ایک ہندوستان کے مندوب تھے۔

۱- ادب کے محققین اور اسکالرس کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ادب اسلامی اور ادب کے بارے میں اسلام کے موقف کو واضح کریں کہ اسلام کے ڈھانچے میں ادب کا کیا مقام ہے؟

۲- صحیح اسلامی نظریہ کے مطابق ادب عربی اور اسلامی ادب کی تاریخ پیش کریں، اور تنقید کے اسلامی طرز کو واضح کریں۔

۳- ادب اسلامی کی جو کتابیں ہوں، ان کی فہرست شائع کی

جائے،اور تقابلی مطالعہ کیا جائے ،تا کہ آنے والی نسلوں کو مسلمانوں کے ادب وثقافت کا علم رہے۔

۴-ادب کے نصاب پر نظر ثانی کی جائے ،اور ہر مرحلہ تعلیم کا علاحدہ نصابی پروگرام تجویز کیا جائے۔

۵- اسلامی ادب کے حامیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے حق کے ذریعہ غیروں کے باطل کا مقابلہ کریں،اور اسے شکست دیں،اور موجودہ ادبی انحراف کو کارآمد ادب کے ذریعہ بدل دیں،اور اسلامی ادب پر ایک رسالہ نکالیں۔

۶-ادب اسلامی کے شہ پاروں کو ترجمہ کر کے دوسری مسلم زبانوں میں پیش کیا جائے۔

۷- اسلامی ادیبوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے آپس کے تعلقات کو مستحکم کریں،اور اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کیا جائے ،جس کی سرگرمیوں میں یہ بات داخل ہو کہ ادب اسلامی پر ممتاز کام کرنے والوں کو اعتراف اور ہمت افزائی کے طور پر انعامات دیں۔

۸-بچوں،نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کے لئے خصوصی طور پر اسلامی ادب پر کتابیں تیار کی جائیں۔

۹-ہلاکت آفریں تحریکوں کا پورا مقابلہ کیا جائے،اور ان کو ناکام بنایا جائے اس میں وہ تحریک بھی ہے جو عامیانہ لہجہ (ALLECTS COLLOQUIRLS) کو فصیح قرآنی زبان پر ترجیح دینا چاہتی ہے،یا عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی حروف استعمال کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

۱۰-اس بات کے امکان کا جائزہ لیا جائے کہ قرآن کے الفاظ سے عربی زبان سکھائی جائے، اور قرآنی الفاظ پر مشتمل ڈکشنری اور تعلیم کی کتابیں مرتب کی جائیں۔

اسی میں یہ ہدایت بھی تھی کہ ان مقاصد کے لئے فکر وجدوجہد کے لئے ایک مستقل سکریٹریٹ ندوۃ العلماء میں قائم کیا جائے، چنانچہ یہ سکریٹریٹ قائم ہوا، جو مجلس ادبیات اسلامی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ عربی میں اس کو "الندوہ العالمیة للأدب الاسلامی" کا نام دیا گیا۔ اس کی ایک مجلس عاملہ مقرر ہوئی، جس کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ طے پائے اور یہ راقم الحروف سکریٹری مقرر ہوا، صدر صاحب کے تین نائب مقرر ہوئے جو عالم عربی کی شخصیتوں میں سے لئے گئے۔

پھر پانچ سال کی فکر وتوجہ کے بعد ۱۹۸۶ء میں باقاعدہ ایک عالمی سطح کے ادارہ رابطہ ادب اسلامی عالمی کی تشکیل کے لئے دوبارہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں رابطہ ادب اسلامی کی انجمن کی تشکیل کا اعلان ہوا، اور اس کا دستور پیش ہوکر منظور ہوا جس میں درج ذیل اصول اور لائحہ عمل طے ہوئے جو دستور کی دفعات میں شامل ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی اپنے اصول وضوابط کی تیسری دفعہ کے بموجب مندرجہ ذیل مقاصد کو اپنا نصب العین بنائے گا۔

۱-ادب اسلامی کا فروغ اور اس کے قدیم وجدید خط وخال کو نمایاں کرنا۔

۲-نقد ادب کے اسلامی اصول کی تدوین۔

۳-جدید ادبی فنون خاص طور سے افسانہ، ڈرامہ، ناول اور سوانحی

ادب کے ادبی معیار کے لئے مفصل نظام کی ترتیب اور ان تمام فنون کو بامقصد اسلامی نہج کے تابع کرنا۔

۴- تاریخ ادب اسلامی خاص طور پر اس کے نثری سرمایہ کی تاریخ کی تدوین جدید، اور مؤرخین نے اس کے جن اعلیٰ نمونوں اور شاہکاروں کو نظر انداز کر دیا ہے، انھیں نمایاں کرنا۔

۵- قابل قدر اور دلکش ادبی تخلیقات اور نگارشات جو اسلامی ادباء کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں، ان کی جمع وتدوین، اور انھیں مختلف مسلم اور غیر مسلم اقوام کی زبانوں میں منتقل کرنا۔

۶- بچوں، نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کے ادب پر خاص توجہ دینا، اور اس ادب کے لئے اسلامی اصول وضوابط کی تشکیل۔

۷- غیر اسلامی اور باطل ادبی تحریکات کا مقابلہ اور ان کے عیوب و نقائص اور خطرات سے دوسروں کو آگاہ کرنا۔

۸- اسلامی تحریکات کی حمایت ونصرت میں اس ادب کا حصہ اور کلمہ حق کے ذریعہ مسلمانوں کا دفاع۔

۹- اسلامی ادب کو عالمی معیار عطا کرنے کے لئے مختلف ممالک کے اسلامی ادباء سے گہرے روابط پیدا کرنا، انھیں کلمہ حق پر متحد ہونے اور آپس میں تعاون کرنے پر آمادہ کرنا، اس طور پر کہ وہ ایسی اسلامی طاقت بن جائیں جس کا ہتھیار بامقصد ادب اور کلمۂ طیبہ ہو۔

۱۰- اسلامی ادباء کے مادی اور معنوی حقوق کا دفاع، اور ان کے ادبی کام کی نشر واشاعت کے لئے وسائل مہیا کرنا۔

ادب اسلامی کے عام اصول وضوابط جن کا رابطۂ ادب اسلامی

کے ارکان اپنے علمی کاموں میں خیال رکھیں، حسب ذیل قرار پائے۔

۱- ادب اسلامی انسانی زندگی، کائنات اور انسان سے متعلق اپنے فنی اور بامقصد وسیلۂ اظہار سے عبارت ہے جو کتاب وسنت کے مطابق ہو۔

۲- ادب اسلامی ایک ایسی حقیقت ہے جو اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی وجود میں آئی، وہ مشکاۃ وحی اور اسوۂ نبوی سے اکتساب فیض کرتا ہے

۳- اسلامی ادباء اسلام اور اسلامی اقدار کے پابند ہیں، اور اپنے ادب میں اسلام کے مبادی اور اس کی تعلیمات سے وابستہ ہیں۔

۴- ادب اسلامی امت اسلامیہ کی قیادت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک اہم ذمہ داری ہے۔

۵- ادب اسلامی ایک مکمل ادب ہے، اور اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ظاہری شکل اور حقیقت میں ہم آہنگی ہو۔

۶- اسلامی ادیب، امت کی فکر اور اس کے جذبات کا امین ہے، وہ اس امانت کا بارگراں اسی وقت اٹھا سکتا ہے جبکہ اس کا تصور صحیح ہو اور اس کی دینی معلومات کافی ہوں۔

۷- ادب اسلامی تمام باطل ادبی نظریات کو مسترد کرتا ہے۔

۸- ادب اسلامی جدید ادبی فنون کے لئے اپنا دامن کشادہ رکھتا ہے، اور وہ ان لوگوں کے سامنے ایسا پاکیزہ ادب بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے، جو لادینی اور اسلام دشمن عناصر سے پاک ہو، اور بیش بہا اسلامی اقدار اور اس کی برحق تعلیمات کا حامل ہو۔

۹- اس ادب کے لئے ایک جدید اسلامی تنقید کی ضرورت ہے،

جو اس کے شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس کے اصول ومبادی طے کر کے اس کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دے تا کہ یہ ادب سر بلند ہو اور اس کی اہمیت واضح ہو۔

ادب اسلامی ایک مکمل اور زندگی سے بھرپور ادب ہے، وہ عام دلچسپی اور قدردانی کا مستحق ہے، اس کے ذریعہ ایک طرف ذوق ادب کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے، دوسری طرف فطرت سلیمہ کے مطابق زندگی کا ایک جائز اور ضروری تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔

ادب کا میدان کار، ہمارے اردگرد کا یہ عالم، ہماری متنوع زندگی اور پھر ہماری ذاتی شخصیت ہے، یہ تین کارگاہیں ہیں، ان کی اہمیت وحقیقت کے بارے میں انسانوں کے تصورات مختلف ہیں، اور اس اختلاف کے اساس خدا، کائنات، اور زندگی کے بارے میں انسانوں کے تصورات علاحدہ ہیں، مذہب کے حامل لوگوں کے تصورات علاحدہ اور مذہب سے باغی لوگوں کے تصورات علاحدہ ہیں، دنیا پر جب سے یورپ کے صنعتی اور فکری انقلاب اور فلسفوں اور افکار کا اثر پڑا، متمدن دنیا کے ذہن میں ایک خاص تبدیلی آئی، یورپ مذہب سے باغی ہوا تو اس نے اپنے اثر وطاقت سے تصورات کی مذہبی اساس کو بہت نقصان پہنچایا، اور طرح طرح کے آزاد فلسفے اور نظریئے پیدا کئے جو نہ تو ہمارے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ تھے اور نہ ہمارے مشرقی ذہن سے، جب خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں خیالات میں تبدیلی آئی تو فطری طور پر ادب میں جس کا دائرہ عمل انہی سے متعلق ہے، تبدیلی آئی اور اس میں طرح طرح کے نظریئے وجود میں آئے، جن کا سرا خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں یورپ کے ملحدانہ

تصورات سے ملتا ہے، اس طرح موجودہ دنیا پر یورپ کے سیاسی اور فکری تسلط کے نتیجہ میں ادب وثقافت کی قدروں میں تبدیلی کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوا جس سے بہت سے خاکے ٹوٹ گئے، اور نئے خاکے بنے، اور ادباء نے اپنے نئے نئے گھروندے بنائے، جو کلاسیکیت اور اس کے بعد رومانیت اور متعدد نظریات سے گذرتے ہوئے، جدیدیت کی نئی شکلوں کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے، ان کے سلسلہ میں ہم جو بھی رائے قائم کریں، لیکن ہمارے مشرق کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ادب کے اسالیب اختیار کرنے میں اور اس کی نظریاتی بنیادیں قائم کرنے میں جو بھی تنوع اختیار کیا جائے، اس میں خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں ہم کو آسمانی رہنمائی کی پابندی کرنا ہے، اس کا دامن نہیں چھوڑنا ہے، بالفاظ دیگر سب کو حق وانصاف سے، اور انسانوں کو خدا سے دور اور ہوا وہوس کا شکار نہیں بننے دینا ہے، اس ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہمارے پاس اسلام کے بتائے ہوئے اصول سب سے اعلیٰ اور مطابق ضرورت اصول ہیں، جن میں ادب کو پوری حریت و وسعت عطا کرنے کے ساتھ خدا بیزاری، انسان آزاری اور خواہش نفس کی غلامی پر پابندی لگائی گئی ہے، ہمیں یہ پابندی قبول کرنا ہوگی، ورنہ ہم پورے عالم کے انسانی نظام کو ایسا نقصان پہنچانے کا باعث بنیں گے جس کی تلافی آسان نہ ہوگی، یہی وہ دعوت ہے جس کو ادب اسلامی کا عنوان ہم دیتے ہیں۔

ادبی کام ایک قسم کا ذہنی کام بھی ہے، جس میں ایک دل ودماغ سے دوسرے دل ودماغ تک پیغام رسانی کی جاتی ہے، خاص طور پر وہ ادبی کام جو ادیب کی طرف سے وجدانی وفنی ہنر کے ساتھ ہو، خواہ وہ شاعری کے

دائرہ کا ہو یا خطابت وافسانہ نگاری اور دیگر نثری اصناف کے ساتھ ہو، لیکن وہ کوئی خشک قسم کا کام نہیں، اس میں علمی وتحقیقی اسلوب اصل ذریعہ نہیں بنایا جاتا، بلکہ اس میں پر اثر تعبیری انداز کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، ان میں کبھی وجدانِ انسانی کو متاثر کرنے والے فقروں سے کام لیا جاتا ہے، اور کبھی خود معنی ومضمون کی شگفتہ وپرکشش ترتیب وانداز سے، گاہے بات کو پھیلا کر گاہے مختصر انداز سے، پھر مخاطب کے فطری احساسات اور جذبات کی نفسیاتی رعایت سے کام لیا جاتا ہے۔

ان ذرائع کی رعایت کے ساتھ جو بات کہی جاتی ہے خواہ واقعاتی ہو خواہ ذہنی، ادب کے زمرہ میں داخل ہوجاتی ہے، اوران ذرائع اور طریقوں کے فرق سے ادب کی چند در چند راہیں بن جاتی ہیں، بالآخر ادب زندگی کے تمام معاملات کی ترجمانی کو پر اثر بنانے کا سب سے کامیاب اور وسیع طریقہ بن جاتا ہے۔

ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے، اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت وصلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ محقق ومفکر ہو، اور خواہ جاہل وعامی، اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے، اسی لئے ادب کے ذریعہ کبھی مخاطب کے وجدان کو صرف لطف ولذت دینے کا کام کیا گیا، کبھی محض اپنی مرضی کے خیال کو جاگزیں کرنے کا مقصد حاصل کیا گیا، اور کبھی مخاطب کے کسی انسانی تقاضے کی رعایت میں تسکین کا سامان کیا گیا، کبھی اس سے اصلاح عوام کا کام لیا گیا، اور پوری پوری قوم میں تبدیلی لے آئی گئی، یا اس کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈال دیا گیا، اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر

مطرود کرنے کا کام لیا گیا، اس طرح ادب ایک طاقت ہے، ایک اثر انگیز ذریعہ ہے، ایک انسانی تقاضہ کا فطری جواب ہے۔

ادبی انداز کلام کا آغاز اصلاً عبادت گاہوں میں اور پروردگار عالم کے سامنے مناجاتوں اور دعاؤں سے ہوا، اور پھر زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیلتا چلا گیا، اب یہ کہنا کہ اس کا تعلق مذہبی زندگی اور عبد و معبود کے مابین تعلقات سے نہیں ہے، بڑی حقیقت ناشناسی اور زیادتی ہے، لیکن یہ زیادتی اور حقیقت ناشناسی مذہب بیزار یورپ نے چلائی اور پھیلائی ہے، ہمارا رابطہ ادب اس زیادتی اور حقیقت ناشناسی کو دور کرنے کا فریضہ انجام دینے کے لئے قائم ہوا ہے، ہمارا رابطہ اس سلسلہ میں پہلا ادارہ نہیں، اس سے قبل بھی صالح اہل ادب نے کوششوں کا آغاز کر رکھا تھا، رابطہ نے اس کو تیز کرنے اور وسیع بنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے، اور اس کے لئے رابطہ کے کاروان ادب نے آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے۔

ہندوستان میں جب تک شاہی دور رہا، ادب لطف و اثر کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ عموماً حاکموں کی پسند کے گرد گردش کرتا تھا، اس کے نتیجہ میں اس میں تصنع بھی آجاتا تھا، اور اس سے ادیب اپنے کمال فن سے متاثر کرنے کا کام بھی لیتا تھا، لیکن کچھ ادباء ایسے بھی ہوتے رہے، جن کا ادب ان کے اپنے تأثرات و تجربات کی عکاسی کا کام انجام دیتا۔ ان کا ادب عموماً تصنع سے پاک رہا، لیکن حاکموں یا دولتمندوں کی سرپرستی کم ملنے سے اس ادب کو قیمت ذرا بڑی نہ ملتی تھی۔

لیکن عوامی دور میں جو انگریزوں کے استعماری ظلم و تعدی کے احساس اور اس سے گلو خلاصی کی خواہش سے شروع ہوا، ادب نے کسی

قصرنشیں اور مالک سیف وتفنگ تک اپنے کو محدود نہیں رکھا، بلکہ زیادہ وسعت کے ساتھ اور اپنی پسند کے میدان میں کام کرنے لگا، اس میں خود صاحب ادب کی ذاتی ترجمانی بھی بڑھی، اور اپنے معاشرہ کے حساس پہلوؤں کی ترجمانی بھی ابھری، اور اس طریقہ سے ادب زیادہ سچا اور انسانیت نواز بنا، معاشرہ کی ضرورت اور تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہوا، ملی اور مذہبی تقاضے بھی شریک بزم بنے، اور ادب نے ان کی بھی خدمت قبول کی، اس کی مثالیں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اہل ادب ارکان کی تحریر وکلام میں ملتی ہیں، پھر علامہ شبلیؒ اور ان کے ہم مذاق معاصرین کے یہاں نمایاں ہیں، دوسری طرف ان کا ظہور علامہ اقبالؒ کی شاعری میں ہوتا ہے، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور اسی طرح کے دوسرے ادباء شعراء کے یہاں چمکتے ہوئے نمونے نظر آتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ادب کے مغرب زدہ ذمہ داروں کے ایک بڑے طبقہ کے نزدیک یہ بات ادب کے مزاج کے خلاف قرار پاتی رہی کہ وہ کسی سنجیدہ و بامقصد رخ سے وابستہ ہو، ان کے نزدیک اس کو بالکل آزاد ہونا چاہئے، اور من مانے اور جی چاہے حدود میں ہی رہنا چاہئے، اس نقطہ نظر سے ان لوگوں کو ادب کے اسلامی رجحان سے مربوط ہونے پر اعتراض ہے، اور ایسے ادب کو وہ صحیح ادب نہیں سمجھنا چاہتے، یہ لوگ اصل دوری مذہب سے رکھتے ہیں، وہ مذہب کے دخل کو برداشت نہیں کر سکتے، اسلام کے خیال ورجحان کے ساتھ اس کی وابستگی کو پسند نہیں کرتے، ان کے لیے یہ پریشانی کی بات ہوتی ہے کہ ادب میں ان کو مذہب سے سابقہ پڑ جائے، اور ان کا مزہ خراب ہو جائے، لیکن ان کا یہ طرز عمل دوہری پالیسی کا حامل

ہے، کیونکہ یہی لوگ خشک کمیونسٹ رجحان سے ادب کی وابستگی کو قبول کر لیتے ہیں۔ ادھر گذشتہ کئی دہائیوں میں اردو، عربی اور دیگر زبانوں کے ادب پر تسلط انہی لوگوں کا رہا، ان کے تسلط میں بے مہار اور کمیونسٹ وابستگی والے ادب کو فروغ ملا، اور اسلامی رجحان اور تقاضہ کی موجودگی ادب کو ان کے نزدیک بے ادب بناتی رہی، لیکن الحمدللہ وہ بات اب ختم ہوتی جارہی ہے، اور اسلامی ادب کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے، اس میں ہندو بیرون ہند میں متعدد مخلصین کی کوششوں کا حصہ رہا ہے، تحریک اسلامی کے ادباء کا بھی کام رہا ہے، اور رابطہ ادب اسلامی کی کوششوں نے اس کو اور بھی اجاگر کیا۔

ادب کی کسی نظریہ وخیال سے وابستگی ادبی روح و مزاج کی مغلوبیت کے ساتھ ہو تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ادب صحیح ادب نہیں رہا، لیکن اگر ادب کو مغلوبیت سے سابقہ نہ پڑے تو محض وابستگی کی بنیاد پر ادب کو اپنے ادبی مقام سے ہٹ جانے والا قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

ادب اور زبان

زبان اور ادب کے مابین تعلق بنیادی اور اساسی نوعیت کا ہے، زبان کی حیثیت ادب کے لئے اس کے گہوارہ کی ہے ادب دراصل اسی میں پرورش پاتا ہے، اور اسی سے طاقت حاصل کرتا ہے اور زبان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ادب کے علاوہ زندگی کے دیگر متعدد مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل کا بھی ذریعہ بنتی ہے، اس طرح اس کی اہمیت اور ضرورت انسان کے لئے زیادہ وسیع اور لابدی ہے، انسان کا کام اس کے بغیر مناسب اور بہتر ڈھنگ سے انجام نہیں پاتا، اس کے برخلاف ادب انسانی زندگی کی منجملہ دیگر ضرورتوں میں سے ایک محدود ضرورت ہے انسان کا کام اس کے بغیر بھی چلتا اور چل سکتا ہے، البتہ زبان اپنی طاقت اور اثر پذیری کے لئے ادب ہی کو ذریعہ بناتی ہے اور بعض وقت انسان اس کے ذریعہ وہ کام انجام دیتا ہے جو فوج اور اسلحہ کی طاقت سے بھی انجام نہیں پاتا لیکن زبان اپنی افادیت زندگی کے وسیع ترین پہلوؤں میں رکھتی ہے اور اس کا استعمال اور اس سے استفادہ انسان کے لئے آسان بھی ہوتا ہے، وہ علاقہ علاقہ، قوم قوم، اور بعض وقت پیشہ پیشہ اور مذہب مذہب کے فرق سے اپنی مختلف ساخت رکھتی ہے، اور اس طرح اس کی شکلیں سیکڑوں اور ہزاروں بنتی ہیں اور

جس قوم اور جس نسل کو جس طرح کی شکل موافق پڑتی ہے وہ اس کو اختیار کر لیتی ہے، زبان کے آسان ہونے ہی کی وجہ سے ہر کس و ناکس اس کو استعمال کرتا ہے اور اس کے ذریعہ مقصد برآری کرتا ہے لیکن ادب ایک ہنر ہے، ایک امتیازی صلاحیت ہے اس پر دسترس ہر ایک کو نہیں ہوتی اور جس کو اس پر دسترس ہو جاتی ہے وہ اپنا اور اپنی بات کا سکہ دوسروں پر جما لیتا ہے، اور اس کو اس کام کے لئے زبان ہی کو ذریعہ بنانا ہوتا ہے وہ اسی کے مختلف اجزاء اور مختلف انداز میں ردو بدل اور حسب طلب پیرایہ بیان اختیار کر کے اثر و طاقت پیدا کرتا ہے اور رعنائی خیال کا ثبوت دیتا ہے اس کا سلیقہ و صلاحیت وہبی بھی ہوتی ہے اور کسبی بھی، اگر وہبی صورت میں حاصل نہ ہو سکے تو کسبی صورت اختیار اختیار کی جا سکتی ہے، جو کوشش و محنت سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے، ادبی کاوش خواہ بصورت نثر ہو یا بصورت شاعری ہر قوم اور ہر زبان کے لوگوں میں اصحاب ذوق کا میدان عمل بنتی رہی ہے اور وہ اگر مضر یا مذموم مقاصد کے تحت نہ ہو تو وہ انسان کی ایک اہم ضرورت اور اس کے جائز انسانی تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد و معاون بنتی ہے وہ فی نفسہ نہ بری ہے نہ اچھی ہے، اس کو اس کے مقصد اور مدعا کے لحاظ سے ہی بری یا اچھی قرار دیا جاتا ہے، ادب کی صلاحیت رکھنے والے کو چونکہ خود بھی اپنے اس عمل سے تسکین قلب اور لطف خیال حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ اس کو بعض وقت محض اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لئے اختیار کرتا ہے، اور بعض وقت دوسروں میں احساس ابھارنے اور توجہ بڑھانے کے لئے اختیار کرتا ہے، اس میں کبھی تو معاشرہ کو اچھے رخ کی طرف موڑنا اور اس میں مفید انسانی احساسات کو متحرک کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کی دلچسپی کو اپنی ذاتی مصلحت کے لئے اپنی طرف موڑنا مقصود ہوتا ہے ادب کی تعریف میں اس کی

مثالیں بھی خاصی ملتی ہیں کہ اس ذریعہ سے شعراء اپنے نفس یا اپنے جاہ یا مال کی طلب کا اپنا مقصد حاصل کرتے رہے ہیں۔

ہم کو ادب کی تاریخ میں دونوں طرح کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ان میں اعلیٰ مثالیں اس ادب کی ہیں جس میں انسانیت کا فائدہ رہا ہے اسمیں انسانی احساس و کردار کو جو بعض وقت سویا ہوا یا غفلت میں محو ہوتا ہے بیدار کرنا اور متحرک کرنا مقصود رہا ہے اور بعض وقت اپنے پروردگار کی رضا کے لئے اوع انسانیت نوازی کے لئے اپنی صلاحیت ادبی کو ذریعہ بنانا ہوتا ہے اس نوع کے ادب کو ہم اسلامی کہتے ہیں، یہ ادب بھی ادبی ذخیروں میں خاصی مقدار میں پایا جاتا رہا ہے لیکن چونکہ اس میں خیر کا اور خیر پسندی کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لئے آزاد خیال اور بیباک طبیعتوں کے حامل لوگوں کو وہ پسند نہیں آتا، وہ اس کو انسانی آزادی کی بیبا کی میں حائل سمجھتے ہیں، ان کو صالح اور انسانی ادب کو قبول کرنے میں الجھن ہوتی ہے، ان کی یہی الجھن ادب اسلامی کو ماننے اور تسلیم کرنے میں مانع بنتی ہے، یہ ادب کا کام کرنے والوں کی ایک بوالعجبی ہے کہ ادب کو اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر اپنے ہوا و ہوس کی خاطر داری کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ ادب قرار دیا جاتا ہے اور اس کی طاقت اور اس کے اثر کو اس کے درخت کا لذیذ پھل تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہی ادب جب انسان کی فلاح کے لئے اپنی طبیعت میں گداز اور اپنے احساس میں انسانیت ابھارنے کے مقصد میں کام آتا ہو یا دوسروں کے دلوں میں اچھا احساس ابھارنے کا ذریعہ بنتا ہو تو اس کو ادب کی فہرست میں شامل کرنے میں تکلف محسوس کیا جاتا ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے اور صحیح ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ صحیح اور با مقصد ادب اور انسانیت کی مصلحت کے لئے معاون ادب ایک مثبت اور خیر خواہ عمل ہے جس سے انسانیت کو قوت ملتی ہے اور

انسانیت کی صلاح وفلاح میں وہ ممد ومعاون ہوتا ہے اور جس طرح ہم انسانیت کے خیر وفائدہ کے لئے اپنی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں ہم کو اپنی یہ صلاحیت بھی جو زبان وادب کی راہ سے اختیار کی جاسکتی ہے استعمال کرنا چاہئے اور جو استعمال کی گئی ہو اس کی قدر کرنا چاہئے۔

ادب اسلامی کا تخیّل و محرکات

ادب اسلامی کا تصور اپنے وجود کے لحاظ سے کوئی جدید تصور نہیں ہے البتہ ذہنوں میں یہ تصور اپنے صحیح خط و خال کے لحاظ سے زیادہ واضح نہیں ہو سکا، چنانچہ بعض حضرات ادب اسلامی کا مطلب صرف ایک تبلیغی قسم کا ادب سمجھتے ہیں اور بعض حضرات ادب اسلامی سے صرف تحریک اسلامی ادب مراد لیتے ہیں۔ اسی لئے بعض حضرات کے ذہنوں میں ادب اسلامی کے متعلق تنگ دلی اور قدامت پرستی کا تصور ہے اور بعض حضرات اس کو جزوی اور جماعتی قسم کا اسلامی ادب سمجھتے ہیں۔

ادب اسلامی کے متعلق ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس میں اسلام کی نسبت اسی طرح کی ہے جیسی ان اصطلاحات کے ساتھ ہو جاتی ہے جو مسلمانوں کے قومی دائرہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور صرف مسلم قوم سے وابستگی کے معنی رکھتی ہیں۔

لیکن ادب اسلامی کا جو تصور ہمارے اس پلیٹ فارم سے پیش کیا جا رہا ہے وہ ان مذکورہ بالا مطالب سے وسیع و بلند ہے۔ وہ محدود جماعتی یا قومی دائرہ میں یا ایک تنگ دائرہ میں بند نہیں ہے۔ البتہ وہ ایسا ادب ہے

جس کی اپنی قدریں ہیں اور اپنا مزاج ہے۔ وہ ان قدروں اور اس مزاج کا پابند ہے۔ لہذا ان ہی قدروں اور مزاج کے پیمانوں سے اس کو ناپا جائے گا۔ اور ان ہی کے مطابق اس کا تنقیدی عمل ہوگا۔

یہ مزاج اور قدریں ہم کو اولاً اسلام کی تعلیمات سے ملی ہیں اور ان تعلیمات کے مطابق جو ادبی تخلیقات ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں وجود میں آئی ہیں ان سے ہم کو حاصل ہوئی ہیں۔ اس طویل ادبی ورثہ میں تقریباً وہ تمام اصناف ادبیہ ہم کو مل جاتی ہیں جن کا جیتی جاگتی اور مختلف پہلوؤں پر مشتمل زندگی سے تعلق ہے۔ اور اس طور پر ہم کو ادب اسلامی کو متنوع پہلو رکھنے والی زندگی کی تصویر کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

ادب اسلامی کا سب سے اول اور سب سے بڑا رہبر قرآن مجید ہے۔ پھر یہ ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں صاف طریقہ سے جھلکتا ہوا ملتا ہے اس میں اس کے متنوع قسم کے نمونے ہم کو نظر آتے ہیں۔ ادب اسلامی کے اقسام، انسانی زندگی کے اقسام کی طرح ہیں لیکن وہ اپنی قدروں اور اپنے بنے ہوئے مذاق کے ساتھ مربوط ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب میں تنوع ہے جو آپ کی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپ کی حیات طیبہ میں بحیثیت رسول اور انتہائی متدین فرد کے مختلف پہلو ملتے ہیں تو بحیثیت انسان کے بھی متعدد پہلو ملتے ہیں۔ جن میں ان پہلوؤں کے تعلق سے انسانی مزاج کے نقوش صاف ابھرے نظر آتے ہیں۔ اور چونکہ آپ کے کلام میں بلاغت اور ادبی طاقت بدرجہ اتم تھی اس لئے آپ کی زبان فیض ترجمان ان تمام پہلوؤں کی ادبی عکاسی بخوبی کرتی ہے۔ اور اس طرح آپ کی زندگی کے حالات و

احساسات کی ترجمانی خود آپ کے کلام سے بخوبی ہوتی ہے۔ یہ ایک سرمایہ ادبی ہے جس کا جائزہ لینے سے بے شمار ادبی شہ پارے ہم کو ملتے ہیں اور ان ہی سے وہ اولین قدریں اور مزاج ہم کو معلوم ہوتا ہے۔ جو ادب کے اسلامی تصور کا دستور اور رہنما قرار پاتا ہے۔ حالات اور احساسات کی جو ادبی تصویریں آپ کے کلام سے ابھری ہیں ان کی صرف ایک مثال یہاں پر پیش کی جاتی ہے جو باوجود عربی سے اردو میں ترجمہ ہونے کے اپنی طاقت اور چمک سے محروم نہیں ہوئی ہے۔

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا وہ خاصا تھا۔ اس کی تقسیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ایسے پہلوؤں کی رعایت فرمائی جو اسلام کی دعوتی اور حربی مصلحتوں پر مبنی تھے۔ مثلاً اہل مکہ اور ان کے قریب کے قبائل جو پورے عرب میں سب سے زیادہ بااثر اور مسلمانوں کے دشمنوں میں زیادہ سخت دشمن بنے ہوئے تھے۔ مسلسل شکستوں کے اثر سے اب ایسی منزل پر پہنچ گئے تھے کہ اسلام کی طاقت کے سامنے جھکنے لگے۔ اس موقع سے ان کی مالی دلداری ایک اچھی مصلحت تھی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ان اہم اشخاص کو جن کو مانوس اور اسلام سے قریب کیا جاسکتا تھا، مال غنیمت میں عطیے عطا فرمائے اور اس طرح ان کی دلداری کی۔ حضرات انصار جو اہل مدینہ تھے اور اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی دے رہے تھے اس موقع پر مال غنیمت میں سے کچھ زیادہ نہ پاسکے، ان کو بشری بنیاد پر یہ احساس ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سابق ہم وطنوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کی اور اپنے نئے ساتھیوں یعنی انصار کو نظر انداز کیا۔ آپ کو اس احساس کی خبر ملی تو آپ نے حضرات انصار کو جمع فرمایا اور ان کے سامنے ایک مؤثر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر

ادبی طاقت کی پوری نظیر ہے کیوں کہ اس کا موضوع جذبات سے تعلق رکھتا تھا اور خود آپ کے جذبہ و احساس میں بھی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا:-

''حضرات انصار! وہ کیا چرچا ہے جو تم لوگوں کے بارے میں مجھ کو پہنچا ہے وہ کیا گرانی ہے جو تمھارے دلوں نے محسوس کی ہے میں جب تمھارے پاس آیا کیا تم بہکے ہوئے اور گمراہ نہ تھے۔ پھر خدا نے میرے ذریعہ تم کو صحیح راہ عطا کی اور کیا تم محتاج اور تنگ دست نہ تھے۔ پھر خدا نے تم کو میرے ذریعہ غنی بنایا۔ اور کیا تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے؟ خدا نے میرے ذریعہ تمھارے دلوں میں آپس کا تعلق پیدا کیا انصار نے کہا اللہ اور اس کے رسول حقیقتاً بڑے محسن اور صاحب فضل ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم مجھے جواب نہیں دیتے۔ اے حضرات انصار! انھوں نے کہا ہم آپ کو کیا جواب دیں۔ اے اللہ کے رسول احسان و فضل تو اللہ اور اس کے رسول ہی کا ہے۔ آپ نے فرمایا! کیوں نہیں؟ بخدا تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو اور سچ کہو گے اور میں تمھاری تصدیق بھی کروں گا، کہ آپ ہمارے پاس آئے تو اس حال میں تھے کہ جھٹلائے گئے تھے۔ ہم نے آپ کی تصدیق کی اور تعاون و مدد سے محروم تھے ہم نے آپ کی نصرت کی اور اپنی جگہ سے نکالے ہوئے تھے ہم نے آپ کو جگہ دی اور محتاج و پریشان حال تھے ہم نے آپ کی ہمدردی کی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے حضرات انصار تم کو مجھ سے

دنیا کے ایک حقیر فائدہ کی خاطر شکایت ہوئی ہے۔ دنیا کا یہ حقیر فائدہ جس کے ذریعہ میں نے کچھ لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور تم کو میں نے تمھارے اسلام کے سپرد کیا ہے۔ اے حضرات انصار! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ دیگر لوگ اپنے ساتھ بھیڑ بکری اونٹ لے جائیں اور تم اپنے گھروں کو اللہ کا رسول لے کر جاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے تم جو دولت لے کر لوٹو گے وہ اس دولت سے بہتر ہے جس کو وہ لے کر لوٹیں گے اگر ہجرت کا عمل مقدر نہ ہوتا تو میں انصار ہی میں کا ایک فرد ہوتا اور اگر لوگ ایک گھاٹی اور وادی میں سے گذر رہے ہوں اور دوسرے لوگ کسی اور گھاٹی اور وادی سے تو میں انصاری ہی کی گھاٹی اور وادی سے گذروں گا۔

انصار جسم سے وابستہ لباس کی طرح ہیں اور دیگر لوگ اوپر کے اضافی لباس کی طرح ہیں۔ اے اللہ رحم فرما انصار پر انصار کی اولاد پر اور انصار کی اولاد کی اولاد پر۔ راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا فرمانا تھا کہ لوگ رونے لگے حتی کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور سب نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم اپنے حصہ میں لے جائیں ہم اس تقسیم اور اس قسمت پر راضی ہیں۔

(ابوذر غفاری۔ بخاری)

اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جن میں آپ کا کلام ادبی اثر و

طاقت سے بھرپور ہے اور وہ زندگی کے مختلف انسانی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں آپ کے بعد صحابہ کرام اور دیگر متعدد حضرات کے کلام میں ادب کی اسلامی قدروں اور مزاج کے ساتھ نمایاں ملتی ہیں۔

ادب اسلامی کے اس طرح کے نمونے برابر پڑھے جاتے رہے ہیں لیکن اس تصور کے ساتھ کم ہی پڑھے گئے کہ یہ ادب کے ممتاز اور معیاری نمونے ہیں مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ادب کا جو غیر مفید اور بے بہا طرز بن گیا تھا یہ سمجھا جاتا رہا کہ ادب کے لئے یہی نمائندہ طرز ہے اور ادب کو اگر شائستہ دائرہ میں لایا گیا تو گویا وہ اپنی ادبی خصوصیات سے محروم ہو جائے گا۔

اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات

ادب اسلامی اور مغربی تحریکات کا موضوع کسی حد تک نرالا موضوع ہے۔ بعض لوگ ادب کے ساتھ اسلامی کے لفظ کے استعمال پر تعجب کرتے ہیں، ان کے نزدیک ادب کو اسلامی غیر اسلامی دائروں میں تقسیم کرنا صحیح نہیں، شاید ایسا خیال رکھنے والے حضرات کی نظر میں کسی اصطلاح یا لفظ کے ساتھ اسلامی صفت وابستہ کرنے سے صرف وعظ و نصیحت ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادب نہ ہوا وعظ ہوا، اگرچہ وعظ کوئی بے ادبی کا کام نہیں بلکہ کبھی وعظ بھی ادب کی خصوصیات اور صفات کا خاصا حامل ہوتا ہے۔

متعدد صوفیہ و مصلحین امت کے ملفوظات کے مجموعے ادب کے بہترین نمونے شمار کیے گئے ہیں۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی اسلامی ادب کی قیمت و وسعت و طاقت کی خاصی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

ادب نام ہے تجربات کے اظہار کا یہ تجربات ایک حد تک ماحول سے وابستہ ہیں اور ماحول کا اثر وہ سماج ہو یا خارجی ماحول ادب پر پڑتا ہے۔ ادب انسان کا ایک وجدانی عمل ہے اور وہ انسانی وجدان پر اثر ڈالتا ہے۔ لہذا مسئلہ ہے انسان کا اور اس کی زندگی اور ماحول کا اور اسلام انسانی زندگی

کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے وابستہ ہوتا ہے اور اس پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا ادب میں اس کا سرایت کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسلام زندگی کے صرف کسی خاص یا محدود پہلوؤں تک محدود نہیں، وہ تمام پہلوؤں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ادب کے کچھ پہلوؤں کو نہیں بلکہ ادب کی ان حالتوں کو مسترد کرتا ہے جن میں کسی انسان کے معاملہ میں ظلم وحق تلفی ہوتی ہو یا پروردگار عالم کی مرضی پامال ہوتی ہو۔ ان حالات کے ساتھ جو ادب ہوگا، وہ اسلامی ادب کے دائرہ سے خارج ہوگا، باقی حالات میں وہ ہمہ گیر بھی ہے اور روادار بھی۔

اسلامی ادب کا آغاز اس وقت سے ہوا جب قرآن مجید کے بیان پُرتاثیر سے اس کے سامعین متاثر و مستفید ہونا شروع ہوئے پھر حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ان کی صحبت اور کلام بلاغت نظام سے اس کو تقویت (مدد) ملی اور ان کے ماننے والوں میں جن جن کو خوش بیانی عطا ہوئی جس سے انھوں نے دلوں کو متاثر کیا، ان کے کلام سے ادب اسلامی کا سلسلہ بڑھا۔

یہ ادب اپنے طرز و اقسام کے لحاظ سے متنوع بھی ہے، وہ صرف ایک زبان ایک ملک یا ایک عہد میں محدود نہیں، وہ دنیا کی دسیوں زبانوں اور دنیا کے بیسیوں ملکوں اور سیکڑوں سال کی مدت میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شاندار نمونے عربی کے علاوہ فارسی میں، ترکی میں اور اردو میں اور دنیا کے جن جن خطوں کے باشندوں میں مسلمانوں کی تعداد موجود ہے ان خطوں کی زبانوں میں ملتے ہیں۔

جدید یوروپ میں جو ادبی رجحانات پیدا ہوئے، ان کی خاص تاریخ ہے یونان کے فلسفیانہ خیالات مشرکانہ روایات اور ادبی نظریات کا جو

ورثہ یوروپ کو ملا اس سے یورپ کی وابستگی اور شیفتگی نے یورپ میں اور خاص طور پر فرانس میں تعلیم یافتہ نسل پر اثر ڈالا، اس کے ساتھ وہاں کی مضطربانہ زندگی میں سانچوں اور نظریوں میں جو شکست وریخت کا زبردست عمل شروع ہوا اس نے وہاں کی ذہنی زندگی کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا، اور اس میں بے چینی مایوسی، ماضی سے بغاوت جدید کی طلب، اپنی ذات کی تلاش انسانیت سے بدگمانی، مادیت سے وابستگی اور اس طرح کی مختلف کیفیتیں پیدا کیں اور ان سب نے اس کے ماحول اور اس کے افراد پر اثر ڈالا، یہ اثر ان کے ادب کے رجحانات میں بھی ظاہر ہوا اور نئے نئے نظریات بنے اور ٹوٹے۔ شروع میں کلاسیکی نظریہ کی دھوم ہوئی پھر رومانی نظریہ ادب نے اس سے بغاوت کی، لیکن خود رومانی نظریہ کے تصورات میں بہت اختلاف وتنوع پیدا ہوا پھر ذہنوں میں اس سے بھی بے اطمینانی پیدا ہو کر حقیقت نگاری کی تحریک شروع ہوئی۔ اور جلد ہی اس کے بھی متعدد نظریے بن گئے وابستگی کے مسائل پیدا ہوئے اور خطرات نگاری پیدا ہوئی۔ کچھ ذہنوں کی بے چینی ان تدبیروں سے دور نہ ہوئی انھوں نے ادب برائے ادب کے دامن میں پناہ لی اور مقصدی ادب سے دور ہو گئے اور اپنے دامن کو اور کچھ ذہنوں نے ابہام در مزیت میں پناہ کو حل سمجھا، علامت نگاری اختیار کی اور کچھ لوگ اس راہ میں بہت دور تک چلے گئے۔

اور اس طرح یوروپ میں ادبی نظریات کی تاریخ کا ایک ہنگامہ خیز دور گذشتہ تین چار صدیوں کے اندر گذرا، جس کا سلسلہ تا حال قائم ہے۔ یہی زمانہ یورپ کا تمام دنیا پر برتری اور سیادت کا دور رہا۔ چنانچہ وہاں کی قدروں اور نظریات پر حملہ آور ہوئے ہماری قدروں اور نظریات کو ابھی تک

ان حملوں کا سامنا ہے۔

ان باتوں کے باوجود یورپ میں ان گذشتہ صدیوں میں بننے والے نظریات اور قدروں مطلقاً نظرانداز کرنے کی بھی نہیں کیوں کہ یہ سب انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی کیفیات ہیں جو دنیا کی کسی قوم میں جو یورپ کے نشأۃ جدید کا دور تھا جس میں اس کے باشندوں میں علمیت اور ترقی کی کوشش کا ایک عمل مسلسل اور فکر و عمل کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کی جدوجہد تھی۔ جس کے بہت سے پہلوؤں سے ہماری مشرقی قومیں جو اب کئی صدی سے یورپ کے برعکس بے ہمتی اور عزلت گزینی کا شکار ہیں۔ کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

دنیا کا نظام انسانی تجربات پر اور ایک دوسرے سے سیکھنے اور ایک دوسرے کے مفید تجربات کے تبادلہ پر قائم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب نظریات جن کے پس منظر میں یورپ کی زندگی کچھ مسیحی کچھ ملحدانہ پہلو اور اس کے ساتھ نفسیاتی اضطراب مایوسی اور شکست دریخت ہے۔ ہم اپنے اوپر کہاں تک منطبق کر سکتے ہیں، اور کہاں تک کرنا چاہئے۔ ہم اگر احساس کمتری سے اور یورپ کے اساتذہ سے اور اس کے مکاتب فکر میں نشوونما پانے کی وجہ سے پیدا ہونے والی مرعوبیت سے اگر ذرا علاحدہ ہو کر غور کر سکیں اور غیر جانبدار تنقیدی عمل کر سکیں تو شاید زیادہ بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔

اسلام سے وابستہ ادب وسعت کے ساتھ ساتھ رواداری بھی بہت ہے اور اس میں وہ دوسرے نظریات و تصورات ادب سے ممتاز ہے اس کے محدود تحفظات کے ساتھ کوئی ادب بھی ہو اس کے ساتھ اس کا معاملہ سیر چشمی کا ہے، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ادب کے معروف مغربی مکاتب میں اسلامی

نقطۂ نظر سے کیا موافق ہے اور کیا متضاد مغربی مکاتب ادب کے مطالعہ کے موقع سے یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ مغربی ادبی تحریکات مکاتب کا وجود جن سماجی وفکری وذہنی کیفیتوں میں ہوا، ان کا ان مکاتب پر گہرا اثر ہے، ہماری نادانی ہوگی کہ ہم اپنے اسلامی ماحول کو مطلقاً انھیں کیفیات کا شکار تصور کرلیں۔ اور پھر مغربی نظریات ادب کو مسلمہ حقیقتوں کی طرح پوری طرح اپنا لیں اور اپنے ادبوں کے لئے تنقیدی پیمانے انہی سے اخذ کرلیں، اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم کو اپنے ماضی کے ادب کا سارا سرمایہ بے مغز و نامراد قرار دینا پڑے گا۔ اور پھر ہم مفلسوں اور ناداروں کی طرح مغربی ادب کی بارگاہوں میں کھڑے بھیک مانگتے نظر آئیں گے، اور یہ ایک نہایت افسوسناک بات ہوگی۔

ہم کو چاہئے کہ کھلے ذہنوں کے ساتھ لیکن احساس کمتری کے بغیر دیگر نظریات کو ان کے صحیح پس منظر میں رکھتے ہوئے اور اپنے ادبی ورثہ کے خدوخال کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے جائزہ کا کام لیں اور منصفانہ باعزت جائزہ کے بعد جو حاصل ہو اس سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ اچھی باتیں دوسروں کے پاس بھی ہوسکتی ہیں اور اسلام نے ہم کو یہ اصول دیا ہے کہ الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فهو امرحق بها کہ معقول اور کام کی بات مسلمان کی مطلوبہ دولت ہے جہاں ملے وہ وہاں سے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔

اسلامی ادب

ادب کا میدان کار، ہمارے اردگرد کا یہ عالم، ہماری متنوع زندگی اور پھر خود ہماری ذاتی شخصیت ہے۔ یہ تین کارگاہیں ہیں۔ ان کی اہمیت وحقیقت کے بارے میں انسانوں کے تصورات مختلف ہیں اور اس اختلاف کی اساس خدا، کائنات اور زندگی کے بارے میں انسانوں کے تصورات کا اختلاف ہے۔ مذہب کے حامل لوگوں کے تصورات علاحدہ اور مذہب سے باغی لوگوں کے تصورات علاحدہ ہیں۔ دنیا میں جب سے یورپ کے صنعتی اور فکری انقلاب اور فلسفوں اور افکار کا اثر پڑا، متمدن دنیا کے ذہن میں ایک خاص تبدیلی آئی۔ یورپ مذہب سے باغی ہوا تو اس نے اپنے اثر وطاقت سے تصورات کی مذہبی اساس کو بہت نقصان پہنچایا، اور طرح طرح کے آزاد فلسفے اور نظریئے پیدا کئے جو نہ تو ہمارے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ تھے اور نہ ہمارے مشرقی ذہن سے۔ جب خدائے کائنات اور انسان کے بارے میں خیالات میں تبدیلی آئی تو فطری طور پر ادب میں جس کا دائرہ عمل انہیں سے متعلق ہے، تبدیلی آئی، اور اس میں طرح طرح کے نظریئے وجود میں آئے۔ جن کا سرا خدائے کائنات اور انسان کے بارے میں یورپ کے ملحدانہ تصورات سے ملتا ہے۔ اس طرح موجودہ دنیا

پر یورپ کے سیاسی اور فکری تسلط کے نتیجہ میں ادب وثقافت کی قدروں میں تبدیلی کا ایک ایسا مسئلہ قائم ہوا جس سے بہت سے خاکے ٹوٹ گئے۔ اور نئے نئے خاکے بنے، اور ادباء نے اپنے نئے نئے گھروندے بنائے۔ جو کلاسیکیت اور اس کے بعد رومانیت اور متعدد نظریات سے گذرتے ہوئے، جدیدیت کی نئی شکلوں کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے سلسلہ میں ہم جو بھی رائے قائم کریں لیکن ہمارے مشرق کو خاص طور پر مسلمانوں کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ادب کے اسالیب اختیار کرنے میں اور اس کی نظریاتی بنیادیں قائم کرنے میں جو بھی تنوع اختیار کیا جائے اس میں خدا و کائنات اور انسان کے بارے میں ہم کو آسمانی رہنمائی کی پابندی کرنا ہے۔ اس کا دامن نہیں چھوڑنا ہے۔ بالفاظ دیگر ادب کو حق وانصاف سے، اور انسانوں کو خدا سے دور اور بد ہوا و ہوس کا شکار نہیں بننے دینا ہے۔ اس ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہمارے پاس اسلام کے بتائے ہوئے اصول سب سے اعلیٰ اور مطابق ضرورت اصول ہیں۔ جن میں ادب کو پوری حریت ووسعت عطا کرنے کے ساتھ خدا بیزاری، انسان آزاری اور خواہش نفس کی غلامی پر پابندی لگائی گئی ہے۔ ہمیں یہ پابندی قبول کرنا ہوگی، ورنہ ہم پورے عالم کے انسانی نظام کو ایسا نقصان پہونچانے کا باعث بنیں گے جس کی تلافی آسان نہ ہوگی۔ یہی وہ دعوت ہے جس کو ادب اسلامی کا عنوان ہم دیتے ہیں۔

ادبی کام ایک قسم کا ذہنی کام بھی ہے۔ جس میں ایک دل ودماغ سے دوسرے دل ودماغ تک پیغام رسانی کی جاتی ہے۔ خاص طور پر وہ ادبی کام جو ادیب کی طرف سے وجدانی وفنی ہنر کے ساتھ ہو۔ خواہ وہ شاعری کے دائرہ کا ہو یا خطابی وافسانہ نگاری اور دیگر نثری اصناف کا ہو۔ لیکن وہ کوئی خشک فکری کام

نہیں، اس میں علمی تحقیقی اسلوب کو اصل ذریعہ نہیں بنایا جاتا، بلکہ اس میں پر اثر تعبیری انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس تعبیری انداز کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں کبھی وجدان انسانی کو متاثر کرنے والے فقروں سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی خود معنی و مضمون کی شگفتہ و پرکشش ترتیب و انداز سے، گاہے بات کو پھیلا کر اور گاہے مختصر انداز سے، پھر مخاطب کے فطری احساسات اور جذبات کی نفسیاتی رعایت سے کام لیا جاتا ہے۔

ان ذرائع کی رعایت کے ساتھ جو بات بھی کہی جاتی ہے خواہ واقعاتی ہو خواہ ذہنی، ادب کے زمرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور ان ذرائع اور طریقوں کے فرق سے ادب کی چند در چند راہیں بن جاتی ہیں۔ بالآخر ادب زندگی کے تمام معاملات کی ترجمانی کو موثر بنانے کا سب سے کامیاب اور وسیع طریقہ بن جاتا ہے۔

ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے۔ اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے۔ وجدان کی طاقت و صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے۔ خواہ وہ محقق مفکر ہو اور خواہ وہ جاہل و عامی، اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے۔ اسی لئے ادب کے ذریعہ کبھی مخاطب کے وجدان کو صرف لطف و لذت دینے کا کام کیا گیا، کبھی محض اپنی مرضی کے خیال کو جاگزیں کرنے کا مقصد حاصل کیا گیا۔ اور کبھی مخاطب کے کسی انسانی تقاضے کی رعایت میں تسکین کا سامان کیا گیا۔ کبھی اس سے اصلاح عوام کا کام لیا گیا۔ اور پوری پوری قوم میں تبدیلی لے آئی گئی۔ یا اس کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈال دیا گیا اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا۔ اس طرح ادب ایک طاقت ہے۔ ایک اثر انگیز ذریعہ ہے، ایک انسانی تقاضہ کا فطری

جواب ہے۔

ادبی انداز کلام کا آغاز اصلاً عبادت گاہوں میں اور پروردگار عالم کے سامنے مناجاتوں اور دعاؤں سے ہوا۔ اور پھر زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اب یہ کہنا کہ اس کا تعلق مذہبی زندگی اور عبد و معبود کے مابین تعلقات سے نہیں ہے۔ بڑی حقیقت ناشناسی اور زیادتی ہے، لیکن یہ زیادتی اور حقیقت ناشناسی مذہب بیزار یورپ نے چلائی اور پھیلائی۔

یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد جو تحریکیں اٹھیں وہ دراصل یورپی ممالک کے سیاسی و مذہبی حالات و سخت ظالمانہ طریقہائے کار ردعمل تھیں۔ اور کسی کے ردعمل میں منفی اثرات غالب ہوتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں اٹھنے والے ردعمل نے سیاسی نظام کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا اور مذہبی دائرے کو تنگ کر کے گرجا کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا۔ اس کے بعد یورپ کے اہل فکر و ادب کا جو ذہن بنا، اسی کے لحاظ سے اس نے دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کو دیکھا، اس نے اسلام کو بھی مسجد کی چار دیواری کے اندر بند کرنے کی کوشش کی، حالانکہ دونوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ یورپ نے رہبانیت کو اپنی اساس بنا رکھا تھا، جو کہ زندگی کے فطری تقاضوں سے جگہ جگہ ٹکراتی تھی۔ لیکن اسلام میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن ہمارے مغربی مفکرین کے یہاں نہ اتنی وسعت تھی کہ دوسروں کو ان ہی کے فکر و عمل کے دائرے میں رکھ کر دیکھیں اور نہ صلیبی جنگوں کے اثر سے وہ اپنے ذہنوں کو اتنا آزاد کر سکے کہ وہ اسلام کا مطالعہ رواداری اور غیر جانبداری کے ساتھ کر سکیں۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ یورپ کے سیاسی و فکری و ثقافتی غلبہ نے مشرقی ذہنوں کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالا، حتی کہ بہت سے مسلمانوں کے ذہن بھی یہی سمجھنے لگے کہ

اسلام میں بھی مذہب کا زندگی کی وسعتوں سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ حالانکہ یورپ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی خواہ سماجی پہلو ہوں۔ سیاسی یا دیگر، جو گنجائش ہے اس کو اسلامی شریعت کا ادنی مطالعہ کرنے والا بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے مذہب اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مابین جو علمی وابستگی ہے وہ کسی واقف کار سے مخفی نہیں ہے۔ اسی لئے جب ہم ادب کے ساتھ ساتھ اسلام کی نسبت اختیار کرتے ہیں تو تعجب پیدا کرنے والا کوئی کام نہیں کرتے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ادب کا اسلام سے قریبی ربط ہے۔ اور اسلام نے ادب کے ساتھ اپنائیت کا رویہ رکھا ہے۔ پروردگار کے دربار میں عرض معروض ہو تو ادبی خوبی کے ساتھ، اس کے برگزیدہ بندے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرمائیں اور مخاطبت اختیار کریں تو ادبی طاقت واثر کو اپناتے ہوئے اور اس عظیم اور مقتدی انسان کو نذرانہ عقیدت پیش کیا جائے اور اس کی خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے تو شعر وادب کا ذریعہ اختیار کرتے ہوئے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ پیرایۂ بیان کی خوبی کی اہمیت خود قرآن مجید کی کئی آیتوں سے ثابت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

"خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" (کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو قوت بیان یعنی اچھا پیرایہ کلام سکھایا) اور قرآن مجید کی خوبی بتاتے ہوئے فرمایا کہ:

" وانه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الأمين ، على قلبك لتكون من المنذرين ، بلسان عربي مبين" ترجمہ: (اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ (جبرئیل) لے کر آیا ہے آپ

کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں)
اور اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء کرام کے متعلق فرماتا ہے کہ "وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" (کہ ہم نے جب کوئی رسول بھیجا تو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اچھے پیرایہ میں ان کے سامنے بات رکھ سکے) اور خود قرآن مجید میں صاف ودلنشیں اور اثر انگیز پیرایہ میں بات کہی گئی ہے۔

انسانی زندگی بہت متنوع ہے اور وہ احساسات وجذبات کی آماجگاہ ہے، اسلام دین فطرت ہونے اور انسان کی فطری ضرورت کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے زندگی کے تمام پہلوؤں کی رعایت رکھتا ہے۔ ادب کا کام زندگی کی ترجمانی ہے۔ ادب الفاظ کے ذریعہ زندگی کے احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا ہم جب ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ وابستہ کرتے ہیں تو یہ بتانے کے لئے وابستہ کرتے ہیں کہ اسلام کے جائز کئے ہوئے وسیع دائرہ زندگی میں کسی بھی امر کے لئے جو الفاظ موثر وکامیاب ترجمانی کرسکیں، ان کے ساتھ جو ادب ہو وہ اسلام کا ہوتا ہے، اس طرح ادب اسلامی محض دعوتی دائرہ میں یا محض وعظ ونصیحت کے اندر محدود نہیں، اس کا دائرہ صحت مند اور اسلام کی طرف سے جائز کردہ زندگی کے تمام احساسات کی ترجمانی کا ہے۔ شاعری میں مدح سرائی ہو، غزل ہو یا مرثیہ گوئی ہو، اور نثر میں افسانہ ہو ناول ہو یا کوئی انشائیہ ہو یا خطبہ ہو یا خطوط ہوں، وہ سب ادب ہونے کے ساتھ اسلامی دائرہ کے اندر سمانے کے لائق ہونے پر صفت اسلامی سے متصف ہونے کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ اس کے نمونے مسلمانوں کی تحریروں اور تقریروں کی طویل تاریخ میں بہت ملتے ہیں، اور ان سے مسلمانوں کی زندگی پر اچھے اثرات بھی پڑے ہیں، اور ان سے نوخیز

ذہنوں اور مزاجوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اسلام میں ادب کی سرپرستی اور ہمت افزائی اہل علم واہل ذوق نے تو کی ہی ہے، بہت سے قائدین نے بھی کی ہے۔ قرن اول میں بھی ادب سے دلچسپی کی مثالیں خاصی ملتی ہیں، اولاً تو اس کی سرپرستی قرآن وحدیث سے ہوئی ہے۔ جس کی مثالیں ہم کو اچھی خاصی ملتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں ایک طرف مناجاتیں اور دعائیں ہیں وہاں دوسری طرف قابل قدر اشخاص اور محبین کے ساتھ محبت وتعلق کے بلیغ جملے ہیں اور اغیار سے گفتگو میں جو کلام آپ نے فرمایا ہے اس میں موقع ومحل کی نزاکت کا موثر لحاظ ہے۔ آپ نے ایک بچہ سے جس کا پالتو پرندہ مرگیا تھا، فرمایا "یا عمیر مافعل نغیر ؟" ارے عمیر تمہارا بلبل کیا ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی کمزوری ونزاکت کی رعایت میں ان کی سواری اٹھانے والے سے لطیف استعارہ کے پیرایہ میں فرمایا: "یا أنجشة رفقاً بالقواریر" (ارے انجشہ آبگینوں کے معاملہ میں نرمی برتو) آپ نے بنی عبدقیس سے جو آپ کے قبیلۂ قریش کی نظر میں اغیار تھے ملاقات کے لئے آنے پر زیادہ دلداری اور ملاطفت کا اظہار موثر ودلنواز اسلوب میں بیان فرمایا: "مرحبا بالقوم غیر خزایا ولا ندامی" ("آپ لوگوں کو بہت خوش آمدید" آپ کو کوئی بے احترامی کا معاملہ نہیں ملے گا، اور نہ آپ کو آنے پر افسوس ہوگا۔) صاحبزادہ کی وفات ہوئی تو آپ نے جذبۂ انسانی بلکہ احساس پدری کی عکاسی کرنے والے اسلوب میں فرمایا: "ان القلب یحزن والعین تدمع، ولانقول الا مایرضی الرب وانا علی فراقك یا ابراهیم لمحزونون" دیکھئے کس طرح دل پر اثر ڈالنے والا اسلوب ہے فرمایا: (دل غمزدہ ہے، آنکھیں آنسو بہارہی ہیں، لیکن ہم وہی کہیں گے جس سے خدا راضی ہو، ہم تمہاری جدائی پر اے ابراہیم یقیناً غمزدہ

ہیں۔) اس سب کے علاوہ آپ کی زبان مبارک سے متعدد موقعوں پر ایسے جملے نکلے جو کہاوت اور مثل بن گئے اور آج تک ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ پھر آپ کی گفتگو اور خطاب کو دیکھئے تو وہاں ادبی حسن و تاثیر کی بڑی چھاپ ملتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ آپ کا حضرات انصار سے مؤثر خطاب، حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب، آپ کی وہ دلنشیں تشریح جو آپ نے یہ مثال دے کر کہ "برا کام کرنے والوں کو اگر ان کے رفقاء نے ان کے برے کام سے نہ روکا تو ان کی ایسی مثال ہوگی کہ کسی دو منزلہ کشتی پر اوپر بیٹھے لوگ نچلی منزل میں بیٹھے لوگوں کو اگر دیکھیں کہ وہ دریا سے پانی لینے کے لئے اپنی منزل کے پیندے میں سوراخ کر رہے ہیں اور وہ دوسروں کی مصیبت سمجھ کر اگر سوراخ کرنے والوں کو نہ روکیں گے تو دونوں منزل کے سوار تباہ ہو جائیں گے،" اسی طرح آپ نے اس کی رہنمائی وضاحت کرتے ہوئے جو آپ تمام لوگوں کے لئے لائے پھر کچھ لوگوں نے مانا، اور کچھ لوگوں نے نہ مانا، آسان اور دلنشیں اسلوب میں مثال دیتے ہوئے کہا: "کہ بارش کا پانی زمین پر بہتا ہے مقامی زمین کو سیراب کرتے ہوئے دور کے لوگوں کو بھی بہہ کر پہونچتا ہے۔ اس طرح دونوں زمینوں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ لیکن کچھ زمین سپاٹ پتھر کی طرح ہوتی ہے، پانی سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ ادھر ادھر بہا کر ضائع کر دیتی ہے۔" آپ نے اس مثال سے زمینوں کے حقیقی فائدہ اٹھانے والے اور اس علم کو ضائع کر دینے یا ناقابل قبول سمجھنے والوں سے بڑے سہل اور بلیغ انداز میں تشبیہ دی، آپ نے اپنی زوجہ مطہرہ کی دلداری کے لئے ان سے دلچسپ اور ادبی زبان میں ایک تبصرہ سنا جس میں متعدد بیویوں نے اپنے اپنے شوہروں کے بارے میں اظہار رائے کیا تھا وہ تبصرہ حدیث ام زرع کے نام سے حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔

اسی طرح آپ نے ایک موقع پر اپنی سواری پر شریک سواری سے جاہلیت کے دور کے ایک شاعر کا کلام کہہ کہہ کر سنا کلام اچھا اور دین کی حمایت میں تھا، آپ نے سن کر فرمایا کہ ان اشعار کے شاعر کی زبان نے اسلامی مزاج کے مطابق کام کیا لیکن اس کا دل کافر ہی رہا۔ آپ نے کعب بن زہیر سے اپنی مدح میں قصیدۂ مدحیہ سنا اور باوجود اس کے کہ اس کے قصیدہ میں جاہلی دور کا پورا انداز تھا لیکن وہ نیا نیا مسلمان ہو رہا تھا اس کو اسلام کا تقاضہ اور طرز معلوم نہ ہو سکا تھا لہٰذا آپ نے صرف سنا ہی نہیں بلکہ اس پر انعام بھی دیا۔ اس کے علاوہ آپ اپنے صحابہ کرام کے شعر کہنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بلکہ مسلمان ہو جانے والے شاعروں کو اپنی شاعری دین کی حمایت میں استعمال کرنے کا حکم دیتے۔ آپ نے خود شاعری نہیں کی لیکن نثر میں بڑی بلاغت اور ادبیت ظاہر فرمائی۔ آپ نے انسانی سرشت بتاتے ہوئے ایک بار ایک واقعہ قصہ کی شکل میں اور سہل انداز میں بیان کیا۔ اس قصہ میں ایک نابینا، ایک گنجے اور ایک کوڑھی کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے انسانی فطرت و احساسات اور نفسیاتی حال کی عکاسی آپ کے کلام بلاغت نظام میں بکثرت ملتی ہیں۔ جو ہم کو متوجہ کرتی ہیں کہ ادب اسلام سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسلام کے سایہ میں صحت مندانہ انداز سے چلتا اور کام کرتا ہے۔ اور ہماری مراد اسلامی ادب سے وہی ادب ہے جو زندگی کی رہنمائی انسان کی صحت مندانہ مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق کرتا ہو، اور باوجود تنوع اور وسعت کے صحت مندانہ دائرہ سے باہر نہ چلا جائے۔ ایسا ادب نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت ہے بلکہ تمام انسانوں کی ضرورت ہے۔ وہ انسانی قدروں کا محافظ اور انسانوں کی خوشی و رنج میں شریک مسرت غمگسار الم بھی ہے،

اس کی سرشت اسلامی ہے، مذاق انس و ہمدردی ہے، دائرہ کار میں زندگی اور پوری انسانیت ہے اور عہد نبوت سے شروع ہو کر آئندہ مستقبل کے اندر دور تک پھیلا ہوا ہے۔

ہم کو کسی بھی ادبی نمونہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے تعین کے لئے اس کو ان وسعتوں اور احتیاطوں کے دائرے میں رکھتے ہوئے دیکھنا ہوگا جو ہم کو اسلام کی طرف سے واضح رہنمائیوں میں بتائی گئی ہیں۔ وہ ادبی نمونہ جس قدر ان سے مطابقت رکھتا ہوگا اسی قدر اس کو اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح سمجھا جائے گا۔ اور جس قدر ان سے گریزاں ہوگا اسی قدر اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے دور سمجھا جائے گا۔

مکہ کے ایک شاعر جو مذاہب کی تعلیمات سے واقفیت کے اثر سے جنت، دوزخ، آخرت، خدا، اس کی رضا جیسے خیالات سے واقف ہو گئے تھے اور اپنی شاعری میں ان کا تذکرہ کرتے تھے لیکن اس سے ان کو ایسی ضد ہوئی کہ اس کی بری طرح مخالفت کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے ایک رفیق سفر سے ان کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اور بار بار فرمائش کر کے سنتے رہے۔ پھر فرمایا کہ "آمن لسانه و کفر قلبه" (ان کی زبان نے تو ایمان والی بات کہی لیکن ان کا دل ایمان نہ اختیار کر سکا)

اسی طرح ایک شاعر مسلمان ہوئے اور انھوں نے ایک نظم کہی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور شاعرانہ مضمون کے ساتھ بڑائی کا بھی تذکرہ کیا۔ یہ نظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی۔ آپ نے اس کو خوش اخلاقی کے ساتھ سنا، اس نظم میں ایک شعر ایسا آیا جس میں تعلّی کا انداز حدود بشریت سے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا شعر یہ تھا کہ:

بلغناالسماء مجدنا و جدودنا

وانا لنرجو فوق ذلك مظهرا

''کہ ہماری عزت وعظمت آسمان تک پہونچ چکی ہے۔اور

اب ہم امید کرتے ہیں کہ اس سے بھی آگے جائے گی۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خدا تعالیٰ کے مقام سے گستاخی کا شبہ کرتے ہوئے ٹوکا لیکن آپ نے اچھے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہاں تک پہونچنے کا قصد ہے اے ابولیلی (ابولیلی شاعر کی کنیت تھی) انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت تک۔آپ اس جواب سے مطمئن ہوگئے کہ ان کے کلام میں شان خداوندی سے برابری دکھانے کی شوخی نہیں ہے۔آپ کا ان کے اشعار خوش اخلاقی سے سننا پھر ایک شعر میں جو ایک شک پیدا کرنے والا مضمون محسوس ہوا،اس پر ٹوکنا ایک رہنمائی کا ذریعہ بن گیا،کہ شاعر کو فخر کرتے ہوئے کن حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

اسلام نے مسلمانوں کا جو ذہن بنایا تھا اور ان کے خیالات،امنگوں اور حوصلوں کو اس کے دائرے کا پابند کیا وہ ذیل کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔وہ یہ تھا کہ جاہلیت کے اصولوں میں ایک یہ بات تھی کہ آدمی اگر اپنے خاندان کا یا اپنی پارٹی کا ہے تو وہ اچھا ہے آنکھ بند کر کے تائید و مدد کا حقدار ہے۔اور قابل محبت و تعلق ہے۔لیکن اگر وہ مخالف خاندان یا کیمپ کا ہے تو خواہ حق پر ہو،رواداری کا مستحق نہیں۔ چنانچہ یہ فقرہ محاورہ بن کر رائج ہو گیا تھا کہ اپنے آدمی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم،اسی کے مطابق جاہلیت کا شاعر کچھ لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے کہ:

لایسالون أخاهم حین یندبهم

فی النائبات علی ماقال برهانا

کہ یہ لوگ جب حوادث جنگ پیش آتے ہیں تو اپنے بھائی سے یہ
نہیں پوچھتے کہ تم جنگ میں شرکت کے لئے بلا رہے ہو تو کس
بات پر جنگ ہے، یعنی آنکھ بند کر کے مدد کرتے ہیں۔

وما أنا الا من غزية ان غوت
غويت وان ترشد غزية أرشد

کہ میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں خراب کام کریں گے تو میں بھی خراب
کام کروں گا، وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کام کروں گا۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت وانصاف پسندی کی تعلیم دیتے ہوئے اس ذہنیت سے منع فرمایا۔ اس طرح مسلمانوں کے لئے یہ رائج فقرہ ناقابل قبول ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فقرہ استعمال فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم۔ صحابہ کرامؓ کا چونکہ آپ ذہن بدل چکے تھے، انھوں فوراً سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم کی مدد کرنا تو ہم سمجھتے ہیں لیکن ظالم کی مدد کیسے ہوتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا ظالم کی مدد اس طرح ہوتی ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اس طرح آپ نے اسلامی ذہن کے لئے وہ حدود بتا دیئے جہاں تک مسلمان جا سکتا ہے اور جہاں سے اس کو آگے نہ بڑھنا چاہئے۔

مسلمان کو خواہ ادیب ہو خواہ شاعر ان سرحدوں کو جاننا ہوگا، اور ان کی پابندی کرنی ہوگی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جن کو آپ کی توجیہات ورہنمائی ملی تھی، شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ وہ اسلام کی بتائی ہوئی وسعتوں ہی میں اپنے ادب وشاعری کو چلاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو اجازت بلکہ تائید حاصل رہتی، ان کی شاعری کی وسعتوں میں

مدح بھی تھی اور مرثیہ بھی ، غزل بھی تھی اور ہجو بھی ، واقعہ بیانی بھی تھی اور احساسات کا اظہار بھی۔ لیکن ان سب میں رعایت تھی انسانی قدروں اور اسلام کی حدوں کی ان کی اس احتیاط کوس عہد کے مقتدر اسلامی شاعر حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ کے اس جملہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر کہا جب قریش کے بعض ایسے افراد کی طرف سے جو حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے، آپ کی ہجو کا جواب دینے کے ارادہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا کہ تم ان لوگوں کی مذمت کیسے کروگے جب کہ میں خاندانی طور پر انھیں میں سے ہوں؟ اس پر انھوں نے کہا کہ میں آپ کو ان میں سے ایسا نکالوں گا جیسے گیلے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔

اچھی اور موثر زبان میں مختلف رعایتوں کے ساتھ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی ہجو کی اور خوب کی اور انھوں نے اپنے ایک دوسرے شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

فان أبی ووالده وعرضی

لعرض محمد منکم وقاء

"بلاشبہ میرے باپ اور میرے دادا اور خود میری آبرو یہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کیلئے تمہارے حملہ روکنے کے لئے سینہ سپر ہیں۔"

انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع اور ان کے بدخواہوں کی بدخواہی کے مقابلہ کے لئے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو خوب خوب استعمال کیا اور اپنے فنی ہنر کا اظہار کیا، انھوں نے اپنی شاعری میں زور پیدا کرنے کے لئے غزل کی اصطلاحیں اور تعبیریں بھی فصاحت وجدت طرازی کے ساتھ استعمال کیں۔ اور چونکہ وہ معقول حدود سے باہر نہ تھیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے منع نہیں فرمایا، بلکہ ایک موقع پر آپ نے یہ فرمایا کہ اسلام کی نصرت تلوار اور تیر سے کی جاتی ہے اور شعر و شاعری سے بھی کی جانا چاہئے۔ حضرت حسانؓ اپنی اس سخن گوئی کی بنا پر شاعر اسلام اور شاعر الرسول کہلائے۔ اشعار کے اندر جذبہ و احساس و تاثر کی جو ترجمانی ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اس کے صحیح انداز میں پورا محسوس کرتے تھے۔

اس کی اہم مثال وہ اشعار ہیں جو آپ کے قریشی عزیز کو ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بنا پر ان معافیوں میں شامل نہ کئے جانے پر جو فتح مکہ کے موقع پر عام طور پر دے دی گئی تھیں۔ قتل کر دیئے جانے پر ان کی بہن نے کہے تھے۔ اور ادب میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے رنج والتجا کا مؤثر انداز اختیار کیا تھا۔ ان کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تأثر کا اظہار فرمایا کہ یہ اشعار اگر پہلے سنے ہوتے تو رعایت کر دیتے۔

نثر کا دائرہ قرآن مجید کے نزول سے قبل عربوں میں بہت محدود تھا۔ قرآن مجید کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ وسیع ہوا، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی ادبیت کا اظہار ہوا۔ آپ اس میں تمام دیگر عربوں کے لئے معلم و رہبر نظر آتے ہیں۔ آپ کی تقریریں، گفتگوئیں، تذکرے اظہار تأثر دعائیں و مناجاتیں عربی کا بہترین ذخیرۂ ادب ہیں۔ اور آپ کے زمانہ اور آپ کے زمانہ کے بعد کی نثر پر آپ کے ادب کی نمایاں چھاپ ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقسام کلام میں آپ کے یہاں بھی تنوع ملتا ہے۔ مثلاً زن و شو کے آپسی تبصروں پر بھی ایک گفتگو آپ کے اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ کے درمیان ہوئی تھی جو آپ نے بیان فرمائی اور وہ حدیث میں محفوظ ہے۔ اس میں اس خاص گوشۂ ادبی کی بھی نمائندگی ملتی ہے۔ یہ حدیث ام زرع کے نام

سے موسوم ہے۔

بہر حال اسلامی ادب کو ایک محدود و مجبور ادب محسوس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسلام کو صرف عبادت اور ترک دنیا کا مذہب سمجھنے والے ہی ایسا سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جو اسلام کو زندگی کی وسعتوں کا دور تک ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اس کے مجبور و مقید سمجھنے کی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے۔

ادب اسلامی کیوں؟

ادب اسلامی کا موضوع واقعتاً دل چسپی اور قدر دانی کا ہے، اسکے ذریعہ ایک طرف ذوق ادب کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف دین وملت کا ایک جائزہ اور ضروری تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ادب کے ساتھ اسلامی کیوں؟ ادب ایک آزاد فن ہے، اس کو کسی بھی شکل میں پابند سلاسل کیوں کیا جائے؟ اس پر اسلامی کی قید کیوں لگائی جائے؟

ادب کا میدان کار ہمارے اردگرد کا یہ عالم ہماری متنوع زندگی اور پھر خود ہماری ذاتی شخصیت ہے یہ تین حقیقتیں ہیں، ان حقیقتوں کے بارے میں انسانوں کے تصورات مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی اساس خدا، کائنات اور زندگی کے بارے میں انسانوں کے تصورات کا اختلاف ہے، مذہب کے حامل لوگوں کے تصورات علاحدہ اور مذہب سے باغی لوگوں کے تصورات علاحدہ ہیں دنیا پر جب سے یورپ کے صنعتی اور فکری انقلاب اور فلسفوں اور افکار کا اثر پڑا، متمدن دنیا کے ذہن میں ایک خاص تبدیلی آئی، یورپ مذہب سے باغی ہوا تو اس نے اپنے اثر وطاقت سے تصورات

کی مذہبی اساس کو بہت نقصان پہونچایا اور طرح طرح کے آزاد فلسفے اور نظریئے پیدا کئے جو نہ تو ہمارے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ تھے، اور نہ ہمارے مشرقی ذہن سے۔ جب خدا کائنات اور انسان کے بارے میں خیالات میں تبدیلی آئی تو فطری طور پر ادب میں جس کا دائرہ عمل انہی سے متعلق ہے۔ تبدیلی آئی اور طرح طرح کے نظریئے وجود میں آئے، جن کا سرا خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں یورپ کے ملحدانہ تصورات سے ملتا ہے اس طرح موجودہ دنیا پر یورپ کے سیاسی اور فکری تسلط کے نتیجہ میں ادب و ثقافت کی قدروں میں تبدیلی کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوا جس سے بہت سے خاکے ٹوٹ گئے اور نئے خاکے بنے، اور ادباء نے اپنے نئے نئے گھروندے بنائے جو کلاسیکیت اور اس کے بعد رومانیت اور متعدد نظریات سے گذرتے ہوئے جدیدیت کی نئی شکلوں کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے سلسلہ میں ہم جو بھی رائے قائم کریں، لیکن ہمارے مشرق کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ادب کے اسالیب اختیار کرنے میں اور اس کی نظریاتی بنیادیں مقرر کرنے میں جو بھی تنوع اختیار کیا جائے اس میں خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں ہم کو آسمانی رہنمائی کی پابندی کرنا ہے، اس کا دامن نہیں چھوڑنا ہے بالفاظ دیگر ہم کو ادب سے انسانوں کو خدا سے دور اور ہوا و ہوس کا شکار نہیں بننے دینا ہے اس ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہمارے پاس اسلام کے بتائے ہوئے اصول سب سے اعلیٰ اور مطابق ضرورت اصول ہیں، جن میں ادب کو پوری حریت و وسعت عطا کرنے کے ساتھ خدا بیزاری انسان آزاری اور خواہش نفس کی غلامی پر پابندی لگائی گئی ہے ہمیں یہ پابندی قبول کرنا ہوگا، ورنہ ہم پورے

عالم کے انسانی نظام کو ایسا نقصان پہونچانے کے باعث بنیں گے جس کی تلافی آسان نہ ہوگی، یہی وہ دعوت ہے جس کو ادب اسلامی کے عنوان سے ہم یاد کرتے ہیں۔

ادبی کام ایک قسم کا فکری کام بھی ہے جس میں ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پیغام رسانی کی جاتی ہے خاص طور پر وہ ادبی کام جو ادیب کی طرف سے بقصد وارادہ ہو، خواہ وہ شاعری کے دائرہ کا ہو یا خطابت وافسانہ نگاری اور دیگر نثری اصناف کا۔ لیکن وہ براہ راست فکری کام نہیں اس میں علمی و تحقیقی اسلوب کو اصل ذریعہ نہیں بنایا جاتا بلکہ پر تاثیر تعبیری انداز اختیار کیا جاتا ہے، اس تعبیری انداز کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں کبھی معنی و بیان کی طریقوں سے کام لیا جاتا ہے اور کچھ خود معنی و مضمون کی شگفتہ و پرکشش ترتیب وانداز سے گاہے تفصیل گاہے اختصار سے، نیز حسب موقع دیگر معنوی پہلوؤں کی آمیزش سے پھر مخاطب کی نفسیات اور جذبات کی بااثر رعایت سے کام لیا جاتا ہے۔

ان ذرائع کی رعایت کے ساتھ جو بات بھی کہی جاتی ہے، خواہ علمی ہو، خواہ فکری، ادب کے زمرہ میں داخل ہو جاتی ہے اور ان ذرائع اور طریقوں کے فرق سے ادب کی بے شمار قسمیں بن جاتی ہیں، بالآخر زندگی کے تمام ذہنی کاموں کو پراثر بنانے کا سب سے کامیاب اور وسیع طریقہ بن جاتا ہے۔

ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت وصلاحیت اللہ تعالی نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ وہ محقق و مفکر ہو اور خواہ جاہل و عامی اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے اسی لئے ادب کے ذریعہ سے کبھی

اصلاح عوام کا کام لیا گیا، کبھی پوری پوری قوم کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈالنے کا کام لیا گیا، اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا۔

برصغیر میں برطانوی استعمار کے قدم یہاں کے قائدین و حکمرانوں کی سیاسی غلطیوں سے جمے، لیکن پھر عوامی سیاسی جدوجہد اور ادب کے مختلف ذرائع سے ان کے قدم اکھاڑے گئے، استعمار کے یہ قدم صرف سیاسی میدان ہی میں اکھاڑے نہیں گئے، بلکہ ذہنی و فکری میدان میں بھی اکھاڑے گئے، اس سلسلہ میں سیاسی میدان میں اگر سیاسی کوششوں کا خاصا دخل رہا ہے تو ذہنی میدان میں اصل کام ادب نے کیا ہے، برطانوی استعمار کے اثرات شروع ہونے کے وقت سے ادب کے میدان میں جو جدوجہد اور اصلاحی کام ہوا ہے اس کی ابتدا شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی اصلاحی و سیاسی جدوجہد کی سلوٹوں میں نظر آتی ہے، اس میدان میں خود انھوں نے اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے اپنی پر اثر تقریروں اور اپنے مؤثر رسائل و کتب سے برصغیر کے مسلمانوں کے بہت بڑے حلقہ پر اثر ڈالا جس کی گونج علمی و ادبی حلقوں میں آج تک سنائی دیتی ہے۔ انہی کے قافلوں میں وہ علمائے دین اور ادباء شامل ہوئے جن میں سے بعض نے برطانوی استعمار کو اپنا ہدف بنایا اور بعض نے ملت اسلامی کے تھکے ہارے شکستہ دل و شکستہ ذہن افراد کو سنبھالنے کی کوشش کی، اس سلسلۂ زریں کی ممتاز ہستیوں کے تذکرے ان کے اثر پذیر ادب کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں، فکر اسلامی کے حامل عظیم شاعر سر محمد اقبالؒ غیرت اسلامی کے حامل شعراء ظفر علی خاں، الطاف حسین حالی اکبر الہ آبادی

اور علامہ شبلی نعمانی جن کی مؤثر نظموں اور اشعار نے جذبۂ اسلامی کو مہمیز کیا، برطانوی استعمار سے نبرد آزما ادباء و شعراء میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اسلامی قدروں کے علمبردار علماء و ادباء میں علامہ شبلی نعمانی، علماء سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور اس سلسلہ میں حکایت نگاری سے کام لینے والے ادباء میں مولانا عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور بچوں کے ادب کے سلسلہ میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام سرفہرست آتا ہے، یہ حضرات اور انہی جیسے متعدد دیگر حضرات برصغیر کی ادبی تاریخ میں نگینوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں اسلامی ذہن و دماغ کی حفاظت کا کام ان ادباء کے ذریعہ بہت شاندار طریقہ سے انجام پایا، اسی کے ساتھ ساتھ ان حضرات نے ادب کے سنجیدہ معیار اور اس کی مثالی روش کو بھی بخوبی برقرار رکھا ان میں کئی نہ صرف یہ کہ صاحب اسلوب ہیں بلکہ اردو کے اساطین ادب میں شمار کئے جاتے ہیں۔

جنگ آزادی اور اصلاح عوام کے کام کے لئے جس طرح تحریری ادب نے ایک بڑی ذمہ داری پوری کی ہے، اسی طرح خطابی ادب نے بھی بڑا معرکہ سر کیا ہے، اس میدان میں بھی برصغیر نے بڑے آفتاب و ماہتاب دیکھے ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے خاص طور پر بڑی داد حاصل کی ہے۔

اسلامی ادب جامع ترین ادب

ادب انسان کی ایک ضرورت ہے، وہ اس کے فکر واحساس کے اظہار کو طاقت عطا کرتا ہے، ایسی طاقت جو اس اظہار کو مؤثر اور دلکش بنا دیتی ہے، ادب کے لئے اس بات میں فرق نہیں کہ انسان کا اپنے فکر واحساس کا یہ اظہار اپنے پیش نظر کسی اچھے مقصد کو رکھتا ہے۔ اور کسی اچھے پس منظر سے وابستہ ہے یا کسی غیر انسانی مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے، اور کسی مذموم پس منظر کا نتیجہ ہے، ادب دراصل نام ہے کسی اثر رکھنے والے مضمون کو اختیار کرنے اور اس کو مؤثر طرز کلام میں پیش کرنے کا اور اثر رکھنے والے کسی مضمون کو اختیار کرنا اور اپنی بات کو حسن تعبیر کے ساتھ پیش کرنا ایسا عمل ہے جس کا پڑھنے اور سننے والا اگر صحیح ذوق سے محروم نہیں تو ضرور متاثر ہوتا ہے چنانچہ ادبی صلاحیتوں کے حاملین نے اپنی ان صلاحیتوں سے اپنے مخاطبین کو خوب خوب متاثر کیا ہے، یہ تاثر کبھی کبھی بہت بڑھ جاتا ہے، مضمون کے انتخاب اور اس کے حسن ادا کی اثر پذیری نے ادب سے فائدہ اٹھانے والوں کو بعض بعض وقت اتنا مسحور کر دیا ہے کہ پس منظر میں کوئی خوبی ہے تو، اور کوئی خرابی ہے تو، اور اس کا مقصد تعمیری ہے تو، اور اگر تخریبی ہے تو وہ اس کے

اس نفع وضرر کا احساس نہیں کر سکے۔ دراصل ادب میں انسانی واخلاقی خرابی یا خوبی کا منبع عموماً خود ادب نہیں ہوتا بلکہ ادب کی تخلیق کرنے والے کا ارادہ وعمل ہوتا ہے، خواہ ظاہراً اس خوبی یا خرابی کا انتساب ادب کی طرف ہی کیا جارہا ہو۔ دراصل صاحب ادب کا خود اپنا ارادہ وعمل ہوتا ہے، جو اس کے انتخاب مضمون اور اس کو مخصوص طرز میں ادا کرنے کے اندر مخفی ہوتا ہے، غالباً اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جاہلی شعراء کی مذموم شعر گوئی کے تذکرہ کے موقع پر ان کی شعر وشاعری کی مذمت کے بجائے خود شعراء کی مذمت کی، اور فرمایا:

والشعراء یتبعھم الغاوٗون ۰ الم تر انھم فی کل وادٍ یھیمون ۰ وأنھم یقولون مالا یفعلون ۰ الا الذین اٰمنوا وعملو الصالحات وذکروا اللہ کثیراً وانتصروا من بعد ما ظُلموا۔ اس میں اولاً ان کے کلام سے متاثر اور ان پر فریفتہ ہوجانے والوں اور ان کے پیچھے دوڑنے والوں کی مذمت کی، پھر شعراء کا تذکرہ فرماتے ہوئے ذکر فرمایا کہ یہ بے مقصد ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے، پھر شعراء کی اس قسم کو مستثنیٰ فرمایا جو ایمان وعمل کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو خوب یاد رکھتے ہیں، اور انھوں نے اپنے اوپر ہونے والی کسی زیادتی کا شکار ہوجانے پر ہی انتقامی رویہ اختیار کیا ہوتا ہے۔

اس طرح شاعری کے متعلق قرآن مجید میں دو تصور واضح کئے گئے، ایک تخریبی جو ایسی شاعری سے ابھرتا ہے جو بے مقصد وقت گذاری، آوارہ گردی اور بے راہ رو بھیڑ کی سربراہی کی صفت رکھتی ہے، اور دوسرا معقول اور

قابل قبول جو ایسے شعراء کے کلام میں ملتا ہے جو ایمان اور اچھے عمل سے آراستہ ہوتے ہیں، اللہ کو خوب یاد کرتے ہیں، اور انتقامی یعنی ایذا رسانی کا رویہ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب ان کے ساتھ ظلم ہوا ہو، یعنی جاہلیت کے طریقہ پر نہیں جس میں دنیاوی و مادی منفعت یا اپنی نفسانیت کی طلب پر بے گناہ اشخاص کی ہجو و اہانت کرتے تھے۔ اور اپنی منفعت کے لئے الزام تراشی و دروغ گوئی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

ہم جب ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ وابستہ کرتے ہیں تو ہمارا اشارہ اسی طرف ہوتا ہے کہ ادب کو اس طرح تشکیل دیا گیا ہو کہ وہ انسانیت کے صاف ستھرے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتا ہو اور جس کے نتیجہ واثر سے بگاڑ اور خرابی کا دروازہ نہ کھلتا ہو، بلکہ وہ انسان کو ستھرے راستہ پر چلنے میں معاون بنتا ہو، وہ جائز فکر و احساس کی عکاسی کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، ایسا ادب صرف اسلامی ادب ہی نہیں انسانی قدروں والا بھی ادب ہے، اس کو انسانی ادب کا بھی نام دیا جاسکتا ہے، صالح ادب بھی کہا جاسکتا ہے لیکن انسانی یا صالح کے لفظ سے اس کو متصف کرنے سے واضح تصور نہیں ابھرتا، کیونکہ انسانی اور صالح کے لفظ کے ساتھ وابستہ تصورات مختلف اور الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ان سے متعین وضاحت نہیں ہوتی۔ لیکن اسلامی سے واضح دائرہ عمل اور واضح نقش ابھرتا ہے کیونکہ اسلام کی طرف سے جو وضاحت ہے وہ مخفی امر نہیں ہے، قرآن و حدیث اس کے لئے منارۂ حیات ہیں۔

ادب کا ہمارا اسلامی تصور مذکورہ بالا پابندی کے باوجود وسیع انسانی پہلوؤں پر محیط ہے، یہ زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اور

انسان کی تمام ادبی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں حسن انتخاب و حسن ادا کا پہلو بھی ہے، احساس و شعور کی ترجمانی کا سامان بھی ہے، فکر و جذبات کی غذا اور دوا بھی ہے، اس میں فسق و فجور، ظلم و زیادتی، نفس پرستی اور خدا بیزاری کا سامان نہیں ہے، ان کے علاوہ انسانی زندگی کے دیگر تمام پہلوؤں کا حق ادا کرنے کا سامان ہے، یہ انسان دوست، مخلصانہ اور دلکشی کا حامل ادب ہے، اور اسلامی کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ادب ہم کو قرآن مجید کے نزول کے وقت سے ملنا شروع ہوا، خود قرآن مجید میں کلام بلیغ کے جو نمونے ملتے ہیں ان سے ادب کے مختلف النوع طرز اور مختلف مضامین زندگی کا پر اثر اظہار اور انسانی احساس و ذہن کو متحرک کرنے اور تسکین دینے والے انداز ملتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلاغت نظام میں ہمارے لیے بہت سامان ہے، پھر اس ڈگر کی پابندی کرتے ہوئے پندرہ سو سال میں ہزاروں شہ پارے اور انواع واقسام کے ادبی نمونے ظہور میں آئے وہ کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

زبان اور ادب اور ان کا صحیح مفہوم

انسان کی اجتماعی زندگی بنیادی طور پر زبان کے رابطہ پر منحصر ہے، جس کے ذریعہ انسان انسان سے اپنی ضرورت بتاتا اور اپنا احساس منتقل کرتا ہے اگر زبان کا یہ رابطہ انسان کو حاصل نہ ہوتا تو ایک انسان، دوسرے انسان کو اپنی ضروریات، واحساسات سے نیز اپنی معلومات اور تجربات سے باخبر نہ کرسکتا، اور اس کے جو بھی نجی اور محدود ذاتی تجربات واحساسات ہوتے، وہ اسی کی حد تک گھٹ گھٹ کر رہتے اور بالآخر ختم ہو جاتے، اور ان میں باہر سے بھی کوئی اضافہ نہ ہوتا، کیونکہ دوسرے کے تجربات واحساسات معلوم کرنے کا ذریعہ بھی زبان ہے۔

انسان کا کلام جب تک ضروری اور معمولی الفاظ کے دائرے میں محدود ہوتا ہے، تو وہ صرف سادہ زبان میں ہوتا ہے، جو کم علم اور ابتدائی صلاحیت کے لوگ استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کلام میں جب وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک ایک بات کو کئی کئی ڈھنگ سے اور کیفیتوں کے لائق اور موزوں الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کلام صرف زبان نہیں بلکہ ادب بن جاتا ہے۔

ادب کے لفظ کے لئے فیروز آبادی نے قاموس میں یہ لکھا ہے کہ "ھو الظرف و حسن التناول "یعنی شائستگی ہے، اور مناسب طرز پر لینا ہے۔

اور ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ "ادب وہ چیز ہے، جس کو لوگوں میں سے "ادیب" یعنی مؤدب آدمی اختیار کرتا ہے اس کو ادب اس لئے کہا گیا ہے، کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں میں لگاتا ہے، اور بری باتوں سے منع کرتا ہے۔" اور لکھا ہے کہ:

"ادب کے معنی کی اصل دعاء یعنی دعوت دینا ہے، اسی سے اس دعوت کو جس میں لوگ بلائے جائیں "مدعاۃ" اور "مادبہ" کہتے ہیں۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے منقول حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ "ان ھذا القران مأدبۃ من اللہ فی الأرض۔ فتعلموا من مأدبتہ" کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر دعوت ہے لہذا اس کی دعوت سے سیکھو۔

ادب کی تعریف امام "عبدالقاہر جرجانی" نے یہ کی ہے کہ "ادب اس بات کو جاننے سے عبارت ہے جس کے ذریعہ ہر طرح کی غلطی سے بچا جائے خواہ وہ غلطی لفظی ہو یا معنوی" وہ کہتے ہیں:

الأدب عبارہ عن معرفۃ مایحترزبہ عن جمیع أنواع الخطاء لفظا و کتابۃ"

ابن ہذیل نے "عین الادب" میں لکھا ہے کہ

ادب کی دو قسمیں ہیں، طبعی، اور کسبی، طبعی میں اخلاق حسنہ اور صفات محمودہ آتی ہیں، اور کسبی میں وہ باتیں آتی ہیں جو مطالعہ، وحفظ اور غور سے حاصل ہوتی ہیں"۔

زبان کے لئے عربی میں "لسان" "لغۃ" اور لہجہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

لسان تو اس عضو لسانی کا نام ہے جو کلام انسانی کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہذا اس کے عمل کے نتیجہ سے حاصل ہونے والی چیز یعنی کلام انسانی کو بھی "لسان" کہہ دیتے ہیں۔

اللغۃ کے معنی قاموس میں یہ بتائے گئے ہیں کہ: "أصوات یعبر بھا کل قوم عن أغراضھم" یعنی لغت ایسی آوازیں ہیں جن کے ذریعہ جماعت انسانی اپنے مطالب کا اظہار کرتی ہے۔

اور لسان العرب نے لکھا ہے کہ لفظ، اللغۃ اسماء ناقصہ، میں ہے اور اس کی اصل لغۃ ہے، جس کے معنی تکلم کے یعنی بات کرنے کے ہیں۔ عربوں نے تینوں لفظ انسانی کلام کے لئے استعمال کیے ہیں، لسان اور لغۃ تقریباً مرادف معنوں میں اور لہجہ کسی وسیع زبان کے اندر کی اکائی کے لئے۔ مثلاً لغۃ سارے عرب کی ایک تھی البتہ لہجات قبیلوں قبیلوں کے علاحدہ تھے، اور کبھی توسعاً لہجہ کے لئے بھی لغۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

لغۃ کا اصل تعلق مفردات الفاظ کے ان معنوں سے ہوتا ہے، جن معنوں میں وہ مفرات الفاظ اہل زبان میں مستعمل ہوتے ہیں انہیں مفہوموں کے اندر رہتے ہوئے الفاظ کے کسی مجموعہ یعنی عبارت کے لئے بھی اللغۃ کا لفظ کبھی مفردات الفاظ کے علاحدہ علاحدہ معانی ومطالب کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اسی سے اردو والوں نے معجم کے لئے لغات کا لفظ استعمال کیا ہے اور کبھی ان مفردات کے مجموعے یعنی کلام کے معنی میں استعمال کیا ہے، جس کو لسان اور اردو والوں کی اصطلاح میں زبان بھی کہتے

ہیں، لیکن الفاظ کے مجموعے یعنی کلام کی تشکیل میں جمالیاتی پہلو کو جب پیش نظر رکھا جائے تو وہ کلام لغۃ ہوتے ہوئے ادب کہے جانے کا بھی حقدار ہوتا ہے، اس طور پر ادب کا مرحلہ سادہ زبان کے مرحلے کے بعد آتا ہے، اسی لئے زبان وادب کی تعلیم میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے، کہ پہلے سادہ زبان کی تعلیم کا مرحلہ اور اس میں ضروری واقفیت ہو جانے کے بعد ادب کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ادب کا لفظ بہ حیثیت ایک عربی لفظ کے تو قدیم ہے، چنانچہ عہد رسالت میں بھی استعمال ہوا ہے، لیکن اس وقت اس کے معنی متعین طور پر یہ نہ تھے، جس میں بعد میں استعمال کیا جانے لگا۔

اس عہد میں ادب کے مفہوم کے لئے بجائے ادب کے عموماً بیان کا لفظ اور اس کے منظوم جزو کے لئے شعر کے لفظ سے کام چلایا جاتا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو تمیم کا وفد آیا، جس کے رہنما حضرت زبرقان بن بدر تھے، اور ان کے ہمراہ عمر بن الاہتم بھی تھے، حضرت زبرقان کے بارے میں عمر بن الاہتم نے پہلے مدح کی، پھر ان کی بات سے ناراض ہو کر مذمت کے الفاظ کہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر اس سے ناگواری ظاہر ہوئی، تو عمرو بن الاہتم نے کہا، کہ میں ان سے خوش تھا تو وہ اچھی باتیں میں نے ذکر کیں، جو مجھے معلوم تھیں اور مجھے ناراضی ہوئی تو وہ مذمت کی باتیں ذکر کیں، جو مجھے معلوم تھیں، میں اپنی پہلی باتوں میں جھوٹا نہیں، اور اپنی بعد والی باتوں میں بھی سچا ہوں۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "ان من البیان لسحرا وان من الشعر لحکمۃ" کہ بعض بیان (فصاحت کلام) میں جادو جیسا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز سے ایک کم عمر لڑکے نے بڑی فصاحت سے بات کی، اس پر انہوں نے فرمایا "انہ لسحر الحلال"، یعنی وہ جادو ہے جو جائز ہے۔ (زہرالاداب)

دراصل الفاظ و تعبیرات کی تنوع سے واقفیت سے ایک زبان داں کبھی علمی موشگافیوں سے کام لیتا ہے، اور کبھی مخاطبین کے وجدان کو متاثر کرتا ہے۔

افہام و تفہیم کی کوئی بات ہو تو اسی متنوع و مناسب حال الفاظ و عبارت سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو، اس کی وضاحت تشریح و تفہیم میں مقتضائے حال کے مطابق کلام کے اختیار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ہماری علمی و دینی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ہر دور میں اور ہر طرح کے موضوعات میں زبان کی تاثیر سے کام لیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی زبان و تعبیرات میں جو ادبی محاسن اور عبارت کی تاثیر ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے نظر کو صرف اسی پر مرکوز کیا جائے تو وہ خالص ادب معلوم ہوگا۔ قرآن مجید کے ایک ایک جملے و فقرے میں ادبی طاقت کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ حدیث شریف کی عبارتوں میں جو ادبی طاقت و اثر پایا جاتا ہے، وہ عربی کے ماہرین ادب کی عبارتوں میں بھی کم تر ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب کلام سنجیدہ ہوتے تھے، آپ کا سارا کلام ضرورت کے مطابق اور افادیت پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ، کے یہاں عبارت میں تاثیر کی رعایت پوری کی گئی ہے۔

ایک بار عورتوں سے نرم سلوک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا! "رفقا بالقواریر" آپؐ رفقاً بالنساء بھی کہہ سکتے تھے، لیکن

آپؐ نے القوارير یعنی آب گینوں کا استعارہ استعمال فرمایا ظاہر ہے کہ آپ نے اس طریقے سے صرف جنس نساء کا نام لینے پر بات کو محدود نہیں رکھا، بلکہ اس طبیعت اور ساخت کی کیفیت کو بھی ظاہر فرمایا جو اسی جنس کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ اس ادبی رعایت کی وجہ سے ہوا جو اس استعارہ کے استعمال سے ہوئی۔

فتح مکہ کے موقع پر داخل شہر ہوتے ہوئے حضرت حسانؓ نے جو اشعار کہے، اس میں حضرت عمرؓ نے یہ پہلو محسوس کیا کہ ایسا سنجیدہ اور عملی موقع، اور اس وقت ادب و شاعری چنانچہ انہوں نے منع کرنے کی کوشش کی، لیکن آپؐ نے فرمایا ان کو کرنے دو یہ ان دشمنوں کے لئے تیروں سے زیادہ سخت ہے۔

صحابہ کرامؓ کے کلام کو لے لیجئے، سب کے یہاں ان امور کا اہتمام نظر آئے گا، جس سے ادب کا معیار بنتا ہے، خواہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں، خواہ حضرت عثمانؓ و علیؓ۔ صحابہ کرامؓ کے بعد کی مثالوں میں، حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت حسن بصریؒ، امام ابن تیمیہؒ و امام ابن قیمؒ امام ابن الجوزیؒ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور بہت سے دیگر اہل دین و علماء ملیں گے، جن کا کلام ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے، اور جن کا ادب توازن اور سلامت و تاثیر سے آراستہ ہے، اور ان کی عبارتوں میں وہ اثر پذیری ملتی ہے جو ادب کی خصوصیات میں داخل ہے۔

کسی بھی علم کی وضاحت اور کسی طرح کے تجربات و معلومات کا اظہار، اور کسی طرح کے احساسات و جذبات کی تعبیر صحیح طور پر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم ان کی فطری طاقت و کیفیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی

صحیح حیثیت وکیفیت کے مطابق الفاظ کا انتخاب اور عبارت کی تشکیل کریں، کہیں پر ایجاز کا تقاضہ ہوگا کہیں پر اطناب کا، کہیں پر سہولت وسلاست ضروری ہوگی، کہیں پر جزالت وفخامت۔

علمی واستدلالی موضوعات میں سہولت وسلاست ضروری ہوتی ہے، اور ادبی وفنی موضوعات میں حسن تعبیر وجمال عبارت، ہمارے سلف اہل زبان وقلم نے ان باتوں کی برابر رعایت کی ہے، خالص ادبی موضوعات تو ادب کی رعایتوں کے بغیر قابل قبول ہی نہیں ہو سکتے تھے، علمی وتعلیمی موضوعات میں بھی اسلاف نے زبان کی صحت اور خوبی کا لحاظ رکھا ہے، نحو وصرف بلاغت ولغت کی کتابیں ادب کے اصولوں اور تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ زمخشری کی ''المفصل'' دیکھئے، ابن ہشام کی شرح ''شذور الذہب'' اور شرح قطر الندیٰ'' عبدالقادر جرجانی کی ''دلائل الاعجاز'' اور اسرار البلاغۃ'' دیکھئے اور ابن منظور کی ''لسان العرب'' اسی طرح علوم دینیہ وشرعیہ میں ابن القیم کی زاد المعاد'' شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور امام غزالیؒ کی ''احیاء العلوم'' یہ سب ادب کے تقاضوں کی پوری رعایت پر مشتمل ہیں جس کی وجہ سے ان کی افادیت اور تاثیر میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

ان چند مذکورہ اشاروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ادبی طاقت کا استعمال علم ومعلومات کو مخاطب کے ذہن وقلب میں اتارنے کا اور موضوع کو دلنشیں اور لائق قبول بنانے کا بڑا ذریعہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مستند پیرووں نے نہ صرف اس سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا ہے بلکہ خطباء اور اہل قلم نے بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے اس کی رعایت کی ہے۔ لہذا مخاطب کی صلاحیت علم کے لحاظ سے کلام استعمال

کرنا ہمیشہ ضروری ہے، تعلیم وتدریس کی کتابوں میں جو زبان اختیار کی جاتی ہے، اس میں بھی جب اس کی رعایت کی جاتی ہے تو تفہیم وتوضیح میں اس سے مدد ملتی ہے۔

زبان کی تعلیم میں ہم کو تین پہلو دیکھنے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ ہم جو اجتماعی زندگی گذار رہے ہیں وہ کس زبان سے وابستہ ہے، دوسرے یہ کہ حصول زبان کا ذریعہ یعنی کتابیں اور نصاب یہ کہاں تک ہماری قدروں، اور امنگوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کتابوں اور نصاب کی علمی و لفظی سطح پڑھنے والے کی فہم وادراک کی سطح کے مطابق ہے یا نہیں!

انہی مذکورہ بالا باتوں کی اہمیت کی وجہ سے ہم کو بعض وقت کئی کئی زبانیں پڑھنی اور پڑھانی ہوتی ہیں کہ ایک زبان ہماری زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی، نیز ہم کو اپنا الگ نصاب بنانا یا اپنا انتخاب کرنا پڑتا ہے، تاکہ ہم کو ہماری قدروں کے خلاف باتوں کو قبول کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے، اور زبان جب ادب کے مرحلہ میں پہونچے تو ادب کا وہ پہلو ہم کو حاصل ہو، جو ہماری زندگی کی شعوری ضرورتوں، ہماری اخلاقی ودینی قدروں اور ہمارے جذبات کی مناسب کیفیتوں کے اظہار کا مناسب ذریعہ بن سکے، اسی لئے تعلیم ومطالعہ میں کس طرح کا ادب ہمارے لئے سازگار ہے اور کس طرح کا ناسازگار ہے، اس کے لئے صحیح فیصلہ کرنا، اپنی اور اپنی ملت کی بڑی خدمت ہے۔

الفاظ جب اثر رکھتے ہیں

الفاظ جب صاحب الفاظ کے احساس وتأثر کو، اس کی خوش دلی اور بددلی کو، اس کے جذبے وتڑپ کو اس کے کیف ومسرت اور اس کی رنجوری ودل فگاری کو ادا کرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو وہ ادب کا ساز بن جاتے ہیں، اور جب الفاظ کسی صاحب علم کے علم وتحقیق کو، اس کی عقلی کاوش اور اس کے نتیجہ فکر کو اور اس کے نقطہ نظر کو سنجیدہ انداز میں پیش کرنے کا کام کرتے ہیں تو علم وواقفیت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اور علمی دائرۂ عمل میں اپنے طے شدہ مفہوم ومعنی اور طے کردہ اصطلاحات اور متعینہ حقائق کو ادا کرتے ہیں، لیکن ادب میں الفاظ اصلاً موقع ومحل، حالات وکیفیات کے حق کو ادا کرتے ہیں، اور صاحب الفاظ کے اندرونی محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں، اس کام کے لئے وہ کہیں محاروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور کہیں تلمیحات کا روپ اختیار کرتے ہیں، کہیں حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور کہیں مجاز کی، اور کہیں کسی دلنواز یا دل فگار واقعہ کی یاد دلا دیتے ہیں اور کہیں صدق بیانی کا فرض انجام دینے کے لئے نرم اسلوب اور سادہ انداز میں دل کو چھونے والی بات کہتے ہیں، یہی وہ رنگ ہے جو ادب کو قوت واثر کا

حامل بناتا ہے، اور عبارت میں وہ اثر و کشش پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ دلوں میں اتر جاتا ہے اور رجحانات کو نیا موڑ دیتا ہے، اپنی انھیں خصوصیات کے ذریعہ وہ کبھی خواہشات نفس کا ترجمان بن جاتا ہے اور کبھی بہکتے ہوئے قدموں کو تھام لیتا ہے، ادب کے ان دونوں طرح کے اثرات کے نمونے ادب کی تاریخ میں خاصے ملتے ہیں، اور ان کو ادب کے مؤرخ اپنی اپنی پسند اور رجحان کے مطابق کرتے ہیں، اور اپنے ذوق کے مطابق ان کو ادب کے اصل اور قابل توجہ نمونے قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا عمل ذہنوں کی تفریح ولذت، اور کچھ کا عمل انسانی رجحانات کی تشکیل وتربیت ہوتا ہے، ادب کے ذریعہ تشکیل رجحان وتربیت کے عمل نے تاریخ کے بعض ادوار میں غیر معمولی اثر ڈالا ہے، اور پوری پوری قوم کا مزاج بدل دیا ہے۔ جس سے بعض وقت کسی کسی قوم وملک میں انقلاب برپا ہو گیا ہے، اور اسی قسم کے عمل نے مسلمانوں کے سماج میں بارہا بہکتے ہوئے قدموں کو راہ پر لگا دیا ہے۔ یہ وسیع دائرہ میں ہوا ہے، تو اس کی بعض وقت متعدد ادوار میں صوفیوں اور عوامی مصلحین کا کام بھی نمایاں مثالیں پیش کرتا ہے، صوفیوں اور مصلحین کے علاوہ وقتاً فوقتاً مفکرین وقائدین نے بھی اس سلسلہ میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے، ان کے اس عمل کے نمونے ان کے ادب وعلم کے مخلوط کاموں میں ملتے ہیں، جن کو بعض وقت غائر نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے، دونوں گروہوں کے ایسے نمونے ہم کو ان مصلحین اہل علم کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں، عربی اور اردو دونوں میں اس کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں، دوسری زبانیں بھی اس سے خالی نہ ہوں گی۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر دہلی کے

مسلمان جس سراسیمگی مایوسی اور افراتفری کا شکار ہوئے تھے ان کو جامع مسجد دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جس زبان واسلوب میں مخاطب کیا تھا، وہ دلوں میں قوت وہمت پیدا کرنے والا اور عرصہ تک ادبی یادگار رہنے کی حیثیت کا مالک ہے، اسی طرح آزادی سے قبل انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں مسجد کانپور اور دیگر سانحوں کے موقع پر مولانا کے البلاغ اور الہلال کے اداریے ایسے ادبی شکوہ اور زور بیان کے حامل ہوتے تھے جن سے ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں ہلچل پیدا ہوئی، اور جذبہ وتڑپ ابھری، اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں اور بیانات بھی ادبی طاقت کے مالک ہوتے ہیں، تحریک آزادی سے ہٹ کر بھی تاریخ اسلام کی متعدد کتابوں اور سماجی اصلاح کی متعدد تحریروں میں بھی شاندار اور پراثر نمونے ملتے ہیں، اور یہ صرف موجودہ عہد ہی میں نہیں بلکہ سابقہ زمانوں میں بھی ہوتا رہا ہے، عربی میں تو فاتح اندلس طارق بن زیاد کی جنگ سے قبل تقریر جو اس وقت بھی پڑھنے پر خون میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح حضرت حسن بصری کے مواعظ، علامہ ابن الجوزی کی صید الخاطر و دیگر کتابیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں، موجودہ عرب دنیا کے کئی مصلحین قوم کی تحریریں بھی دلوں کو ہلانے والی ملتی ہیں۔

اس طرح کی تحریریں اور تقریریں اگرچہ اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے ادب کے عنوان میں داخل نہیں کی جاتی ہیں، بلکہ ان کو عموماً تاریخ کے موضوع میں شامل سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان سے ادب کا جویا مؤثر نمونے حاصل کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کو حسن بیان اور پراثر ادا کا رجحان دراصل قرآن مجید

اور حدیث شریف سے ملا ہے، قرآن مجید میں نصیحت اور تفہیم کے لئے جو طرز کلام ملتا ہے وہ اپنے مضمون کے اعتبار سے نصیحت، تنبیہ، تعلیم و ہدایت ہے، لیکن اپنی عبارت اور طرز ادا کے اعتبار سے ادب کے اعلیٰ معیار کو بھی مات دے دیتا ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں نصیحت و ہدایت کے موقعوں پر جو اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے وہ جگہ جگہ حسن تعبیر اور اثر پذیری میں ادب کے اعلیٰ نمونوں سے بھی فائق نظر آتا ہے۔

کلام میں اندرونی کیفیت
اور اس کی رعایت کا اثر

ادب وبلاغت کے ماہروں نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے کہ فصیح عبارت میں الفاظ ومعانی دونوں کی علاحدہ علاحدہ اہمیت ہوتی ہے اور ہر ایک کا اپنا مستقل اثر ہوتا ہے البتہ دونوں کے مابین توازن وتناسب کی رعایت ضروری ہے لیکن اسی کے ساتھ اہل نقد وادب نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کلام انسانی میں ان دو بنیادی چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے جو کلام کے اندر قوت وتاثیر پیدا کرتی ہے اور وہ ہے مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت اور اس کے اندر کے احساس کو سمجھ کر عبارت کی تشکیل اس میں مضمون کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے وقت طرفین کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کی رعایت ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔

چنانچہ کلام میں ان دونوں باتوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو تو اس سے کلام کی قوت واثر پذیری میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی رعایت نہ کرنے کی صورت میں کلام اس قوت سے محروم ہو کر ایک ایسا کلام بن کر رہ جاتا ہے جو طاقت واثر سے خالی ہو، چنانچہ خوف وکم ہمتی میں مبتلا شخص کے سامنے

استعمال کردہ ایسا جملہ جس میں اس کی حالت خوف کی رعایت کی گئی ہو بہت مؤثر بنادیتا ہے اور وہی جملہ اگر اس مخصوص کیفیت سے خالی کیفیت کے موقع پر استعمال کیا جائے تو اس کے اندر نہ وہ اثر ہوگا نہ طاقت۔ کوئی ظالم وجابر حاکم کسی کمزور شخص کے سامنے کوئی دھمکی آمیز بات کہے تو یہ شخص اس سے بہت ڈر جائے گا اور اس پر سراسیمگی اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہوجائے گی لیکن اگر یہ دھمکی آمیز جملہ ایک عام آدمی اپنے ہی جیسے عام آدمی یا اپنے سے زیادہ طاقتور کسی آدمی سے کہے تو اس میں وہ طاقت نہ ہوگی۔ بلکہ وہ مضحکہ خیز چیز بن جائے گا اور مخاطب اسے گیدڑ بھبکی اور احمقانہ جملہ سمجھے گا خواہ وہ جملہ فصاحت پر پورا اترتا ہو اور اپنے مفہوم کی ادائیگی بہتر طور پر کررہا ہو، لفظ کا فصیح ہونا اور معانی کا بہتر ہونا یہ دونوں چیزیں مخاطب کے لئے اپنے اندر ادبی دلچسپی کا سامان تو رکھتی ہیں لیکن محض اس بات سے ان میں اثر انگیزی اور مقصد کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں جملوں کا یا عبارت کا یہ مؤثر پہلو دعوتی کام کرنے والے شخص کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں میں اس کی بہترین مثالیں ملتی ہیں جو اسلامی ادب کے شاہکار اور عمدہ نمونے ہیں، اس کی مثال کلام اللہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے ساتھ اس گفتگو سے دی جاسکتی ہے جو دونوں میں اس وقت ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو دعوت ایمان دینے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو اس کے پاس بھیجا، قصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ظالم وجابر فرعون کے دربار میں جائیں اور اسے ایمان کی دعوت دیں ادھر موسیٰ کا حال یہ تھا کہ وہ فرعون کی نظر میں

ایک مجرم ہیں اور اس کی گرفت کے ڈر سے ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ان کو فرعون سے برابر ڈر کا احساس تھا کیوں کہ انھوں نے فرعون کی قوم کے ایک شخص کو غصہ سے مار دیا تھا جس کی بنا پر فرعون ان کی تلاش میں تھا وہ ان سے انتقام لینا چاہتا تھا چنانچہ اس صورتِ حال کے پیش نظر حضرت موسیٰؑ اپنے اس خوف کا ذکر اپنے پروردگار سے کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کی ہمت بڑھاتا ہے اور انھیں اپنی مدد کا یقین دلاتے ہوئے فرماتا ہے: اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ-۴۶) میں تم دونوں یعنی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں۔ اس سے ان کے قلب کو تقویت ملتی ہے اور ان کی کمزوری زائل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو ان کے ساتھ کر کے ان کی مزید تقویت فرماتا ہے ارشاد ربانی ہے:

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝
فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ اَنْ
اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (الشعراء ۱۵-۱۷)

ارشاد ہوا:

"یہ بات بالکل نہیں تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ (ہم نصرت و امداد سے) تمہارے ساتھ ہیں۔ اور سنتے ہیں، تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تم قوم بنی اسرئیل کو چھوڑ دو ہمارے ساتھ جانے دو۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین ملنے سے حضرت موسیٰؑ کا دل مضبوط ہو جاتا ہے اور فرعون کی ہیبت ان کے دل سے نکل جاتی ہے چنانچہ وہ اس

کے پاس جاتے ہیں اور اس سے خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں فرعون غضبناک ہو کر کہتا ہے: اَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔ (الشعراء ۱۸-۱۹) کیا تم کو ہم نے تمہارے بچپن سے ہی اپنی پرورش میں نہیں رکھا تھا اور تم نے اپنی عمر کے متعدد سال ہمارے درمیان گزارے تھے اور تم نے وہ حرکت کر ڈالی جو تم نے کی اور تم احسان فراموشی اور ناشکری کے مرتکب ہوئے (یعنی میری قوم کے فرد قبطی کو قتل کیا اور تم بڑے ناسپاس ہو) اس بات نے موسیٰؑ کو خوفزدہ نہیں کیا انھوں نے اس کا سلجھے انداز میں اور سنجیدہ جواب دیا:

قَالَ فَعَلْتُهَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ ۞ (الشعراء ۲۲-۲۰)

ہاں وہ حرکت میں نے اس وقت کر ڈالی تھی میں اس وقت گمراہوں اور گم کردہ راہ لوگوں میں سے تھا چنانچہ میں تمہارے ہاں سے بھاگ نکلا کیوں کہ مجھے تم سے ڈر تھا پھر یہ ہوا کہ میرے رب نے مجھے دانش مندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کیا اور رہا احسان جتلانا پرورش کا سو وہ ایک احسان تھا لیکن کیا اس احسان کی بنا پر بنی اسرئیل کو غلامی میں ڈال رکھا ہے فرعون اس جواب سے پریشان ہوا تو اس نے ٹھنڈے سادہ انداز میں سوال کیا:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ۞ قَالَ رَبُّ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ

(الشعراء ۲۳-۲۴)

اچھا بتاؤ کہ رب العالمین سے کیا مراد ہے (یعنی رب العالمین مجھ کو مانتے ہو) حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ رب العالمین وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان (مخلوقات) ہیں وہ سب کا رب ہے اور یہ حقیقت ہے اگر تم کو یقین آئے۔

اس گفتگو میں ہمیں دیکھنا ہے کہ سوال وجواب کرنے والے یہ دو فریق کون ہیں؟ اور ایک دوسرے کے تئیں ان کے احساسات کیا ہیں؟ اور ان میں خود اعتمادی عزم وہمت یا بے ہمتی مرعوبیت جیسی کیفیات کچھ ہیں تو وہ کیا ہیں، کیونکہ مخاطبت وسوال وجواب کے اسلوب وطرز ادا پر ان کا سایہ پڑتا ہے اس حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں تو فریق اول یعنی فرعون ایک خود مختار ومطلق العنان، ظالم وجابر اور بہت احساس برتری رکھنے والا بادشاہ ہے وہ ایک بڑی اور طاقتور حکومت کا فرماں روا ہے وہ عظمت وبڑائی کا شدید احساس بھی رکھتا ہے وہ اپنے درباریوں کے سامنے اپنی عظمت وبرتری اور دولت وثروت کا فخریہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى) کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں، اور فخر کرتے ہوئے کہتا ہے (وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ) (الزخرف-۵۱) میرے (محل) کے نیچے یہ نہریں جاری ہیں۔ پھر جس شخص سے فرعون مخاطب ہے اس کی قوم کے مقابلہ میں کمتر حیثیت سمجھے جانے والی قوم کا فرد ہے جس کو ملک کے غالب طبقہ میں ذلیل سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا ہے اور فرعون اپنے مصالح ومقاصد کے لئے اسے غلام بنائے ہوئے

ہے اس قوم کو برابر پست و بے اثر بنائے رکھنے کے لئے فرعون کے حکم سے ان کے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا تا کہ غالب قوم کے گھروں کی خادمائیں بنائی جا سکیں پھر وہ شخص بچپن میں فرعون کے محل میں رہا تھا اور ایک موقع پر اس نے اپنی قوم کے ایک فرد کی حمایت میں بادشاہ کی قوم کے ایک فرد کو قتل کر کے ملک چھوڑ کر فرار اختیار کیا تھا اور مطلوب تھا اب یہ پہلا موقع ہے کہ وہ سامنے آیا ہے اور اس کے پاس کوئی ظاہری طاقت بھی نہیں ہے وہ پیغام لایا ہے جسے پہنچانا ہے اس کی ظاہری پوزیشن مخدوش اور کمزور ہے اور یہ بات دونوں فریقوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہے وہ پر جلال و پر ہیبت فرعونی شاہی دربار میں ماضی کے مقابلہ میں اپنی موجودہ کمزور پوزیشن کو اچھی طرح جانتا ہے چنانچہ یہاں آنے سے قبل اپنے پروردگار سے عرض کر چکا ہے کہ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے لیکن پروردگار نے ہمت دلائی کہ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ۔۴۶) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ کیا ایسی صورت حال میں فرعون سے اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ اسے ان پر اتنا طیش آتا کہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے قتل کا فوری حکم صادر کر دیتا اس کے دربار میں کسی کی مجال دم زدن اور چوں و چرا کا یارا نہ تھا، لیکن ان میں سے کوئی بات پیش نہ آئی حضرت موسیٰؑ کی گفتگو میں عزم اور خود اعتمادی تھی جو دراصل خدا کی طرف سے ہمت دلانے کے اثر سے تھی چنانچہ اسلوب کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو فرعون کی طاقت و غضب کا احساس نہیں ہو رہا ہے حضرت موسیٰؑ اس وقت اگرچہ مصر کے مطلق العنان بادشاہ کی محکوم و معتوب اور غلام قوم کے ایک فرد تھے اور فرعون کے ایک

آدمی کو قتل کرنے کے جرم کے مرتکب تھے لیکن وہ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت ونگہداشت کی ضمانت لے رکھی تھی کہ میں تم دونوں (بھائیوں) کے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت ان کے دل میں تھی اور موسیٰؑ کا دل اس طاقت پر ایمان رکھتا اور اس سے لبریز ومملو تھا۔ چنانچہ وہ فرعون کی طاقت سے مرعوبیت سے خالی تھا۔

یہی وہ قوت تھی جس نے موسیٰؑ کو صاف وصریح گفتگو پر جری بنایا جس سے ان کا اسلوب وانداز بیان ایک مؤثر اور مرعوب کن اسلوب بیان بن گیا جس کا اثر فرعون پر پڑا وہ اپنے تمام لاؤلشکر کے باوجود اپنے احساسِ برتری اور بلا جھجک سخت اقدام کر ڈالنے کی عادت کے باوجود کمزوری کے احساس میں مبتلا ہو گیا اور اس میں طیش اور غضب کی کیفیت نہ پیدا ہو سکی جب کہ دیگر حالات میں یہ اس کی فطرت تھی اور اسی غضبناکی کا وہ عادی تھا حضرت موسیٰ کے کلام کے جواب میں فرعون کا کلام ایسا کلام بن کر رہ گیا جو دو برابر کے اشخاص کے درمیان ہو حالانکہ فرعون اپنے درباریوں اور لشکریوں کے درمیان تھا جو کیل کانٹے سے لیس اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لئے تیار ومستعد تھے اس کے پاس طاقت وقوت اور بڑائی وعظمت تھی لیکن حضرت موسیٰ کو تائید ربانی پر بھروسہ تھا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو قوت بخشی تھی اس سے ان کا دل مضبوط اور قوی تھا اسی لئے انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ فرعون عظمت وقوت والا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے چنانچہ موسیٰؑ اس کا جواب ایسے اسلوب میں دیتے ہیں جو کسی ایسے شخص کا اسلوب ہوتا ہے جسے اپنے مخاطب کی طاقت کی کوئی پرواہ نہ ہو اور وہ اس کی

عظمت وشان اور طاقت وقوت سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو وہ برجستہ جواب دینے اور دوبدو گفتگو کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قصداً کلام کو طول دیتے ہیں اور فرعون کے انفعال وغضب کی کوئی پروا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان خوب دل کھول کر کرتے ہیں جس کا سننا بھی فرعون کو پسند نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ موسیٰ اس کا تذکرہ کریں اور خاص طور پر اس کے بھرے دربار میں جہاں اس نے اپنے کو سب سے بڑا خدا منوا رکھا ہے اور سب اس کے سامنے مرعوب ہیں۔

قرآن یہ تفصیلات حسب معمول اپنے بلیغ اسلوب میں بیان کرتا ہے فرعون نے پوچھا کہ رب العالمین تمام عالموں کا رب کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ تمام عالموں کے رب کا مطلب ہے آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ مخلوقات ان کے درمیان ہے اس کا رب یہ بات تم کو سمجھ میں آسکتی ہے اگر تم میں یقین کی صفت پیدا ہوتی، فرعون نے اپنے اردگرد والوں سے کہا کہ تم لوگ سنتے ہو، یہ کیا کہہ رہا ہے یعنی اپنے درباریوں میں جذبہ ابھارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن موسیٰ اس کے اس کہنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں صرف اسی کا نہیں بلکہ وہ تمہارا بھی رب ہے تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا رب ہے اب فرعون کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے سوائے اس کے کہ اپنی بیزاری کا اظہار سخت فقرہ کہہ کر کرے سو اس نے کہا یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے پاگل ہے موسیٰ اب بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اپنی بات اطمینان سے کہے جاتے ہیں۔ مشرق کا بھی رب ہے اور مغرب کا بھی رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی رب

ہے۔تم اس کو سمجھ سکتے ہو اگر عقل والے ہو۔(الشعراء۲۳-۲۸)

اس حد تک بات پہنچ جانے پر فرعون کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس پر شدید ہیجانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے لیکن وہ اپنے اندر کمزوری اور ضعف محسوس کرتا ہے اس لئے موسیٰ کے ساتھ لفظی بحث ومباحثہ سے آگے نہیں بڑھتا اور لفظی دھمکی دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پاتا، اس نے کہا: اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دونگا حضرت موسیٰ اس کی کمزوری کو محسوس کر کے اب اس کے ذہن کو متاثر کرنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: کہو تو میں اپنی بات کی دلیل بھی تمہارے سامنے پیش کردوں۔

فرعون نے کہا: اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو (الشعراء۲۹-۳۱) اس طرح فرعون کی بات لفظی مباحثہ تک محدود رہتی ہے اور وہ حضرت موسیٰؑ کو بے بس بھی نہیں کر پاتا اور لفظی کھینچا تانی چلتی ہے۔

اس مثال سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ کلام میں اثر اور زور وقوت محض خاص قسم کے الفاظ کے استعمال کردینے سے یا عبارت آرائی سے نہیں پیدا ہوجاتی بلکہ اس کے اندر جو چیز طاقت وقوت پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کلام کے اندر صاحبِ کلام کی شعوری طاقت اور صورتِ حال اور پس منظر کی رعایت اور مخاطب کی شعوری کیفیت کا لحاظ رکھا جائے ورنہ جو شخص خوفزدہ ہو اور نفسیاتی طور پر مرعوب ہو وہ خواہ کتنی ہی طاقتور بات اور اثر انگیز الفاظ استعمال کرے وہ مخاطب پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتا۔ اسی طرح مضبوط دل کا آدمی جو خوف وکم ہمتی سے بالکل محفوظ ہو وہ محض چرب زبانی اور

مرعوب کن جملوں سے کیسے متاثر ہوسکتا ہے دراصل پس منظر کا لحاظ اور مخاطب کی ذہنی وشعوری کیفیت وحالت کی رعایت کلام کو اثر انگیز بنانے میں اہم ترین رول انجام دیتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی مذکورہ گفتگو اس کی بہترین مثال ہے۔

ایک مغرور وسرکش پر ہیبت وجلال، بارعب اور ظالم وجابر بادشاہ اپنی ہی رعایا کے ایک ایسے کمزور وناتواں فرد سے جو اس کے غضب اور ظلم وستم سے اپنے کو بچانے کے کسی بھی مادی ذریعہ سے محروم ہے گفتگو کرتا ہے تو باوجود اس کے کہ دونوں کی حیثیت اور مقام ومرتبہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے فرعون کی گفتگو ایسی ہوتی ہے جیسے ایک فریق اپنے برابر کے مقابل سے کرتا ہے اور ایسا دراصل اس خاص شعوری کیفیت کی وجہ سے ہوا جو حضرت موسیٰؑ کے روبرو فرعون کے دل میں پیدا ہوئی۔

وہ داخلی طور پر حضرت موسیٰؑ سے مرعوب ہوگیا تھا جن کو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جرأت اور ہمت وقوت حاصل ہورہی تھی اور بے خوف ونڈر ہوکر فرعون سے گفتگو کررہے تھے۔

اس قبیل کے قرآن کریم میں بے شمار نمونے موجود ہیں اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو اس کی مثال ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر میں ملتی ہے جو آپؐ نے غزوہ حنین کے بعد انصار کے سامنے فرمائی تھی یہ وہ موقع تھا جب آپ نے مالِ غنیمت کا بڑا حصہ قریش کے درمیان تقسیم فرمادیا تھا اور انصار کو اس سے محروم رکھا تھا اس پر ان کے ایک شخص کو یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرفداری کی ہے اور اس کے ساتھ جانبداری برتی ہے اور اس طرح انصار کے قبیلے کو جو قربانی

وجانثاری اور فداکاری میں آپ کا شریک رہا ہے نظر انداز فرمایا اور اس کا حق پورا ادا نہ کر سکے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے انصار کو جمع فرمایا۔ آپ ان کی اس عارضی جذباتی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی ذہنیت کو بھی جانتے تھے چنانچہ آپؐ نے ان کی اسی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی حالت کی رعایت کرتے ہوئے انھیں مخاطب کیا جس کا اردو ترجمہ گزشتہ ایک مضمون میں دیا جا چکا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تین جہتوں سے نفسیاتی کیفیت کی رعایت پر مشتمل ہے اول یہ کہ آپ نے ان کے اس جذبہ اور احساسِ تعلق کو ابھارا جو انصار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور وہ سب تھا جس میں اتباع کامل اسلام پر یقین اور اس کو ہر چیز پر ترجیح پھر قربانی وجانثاری کا وہ جذبہ جو تمام صحابہ کرام میں غالب اور حاوی تھا اور اسی جذبہ نے مسلمانوں کی جماعت کو کفار کے مقابلے میں طاقت وقوت اور جلادت وصلابت عطا کر رکھی تھی اور جب آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ ان کے اس جذبہ کو حرکت دینے اور بیدار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ان سے اس کا اقرار کرا لیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احسانات بے حد وبے شمار ہیں تو پھر آپؐ نے دوسرے پہلو پر توجہ دی، یعنی ان کی طرف سے پذیرائی خصوصی تعاون اور اخلاص کی قدر اور اس کا اقرار واعتراف فرمایا۔ اور ان کے ایمانی تعلق کو مؤثر ڈھنگ سے سراہا اس طرح ان کے دلوں میں جاگزیں رنج کو دور فرمایا۔ اس میں آپؐ نے ان کے فطری بشری احساس کی پوری رعایت فرمائی اور تسلیم فرمایا کہ انھوں نے مشکل حالات میں آپ کو خوش آمدید کہا اور آپ کا استقبال کیا، آپ کا ساتھ دیا اور اس محبت وایمان

کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کی، پھر جب آپؐ نے دیکھا کہ ان کے دل کھل گئے اور ان میں جو شکایتی اثر پیدا ہوا تھا وہ زائل ہو گیا اور وہ اپنی سابق صفائے قلب پر لوٹ آئے تو آپ نے انھیں ان کے ایمان کی قدر و قیمت اور قربانی و جانثاری میں ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ فرمایا، ان کے لئے دعا فرمائی، ان کی تعریف کی، اپنے لئے ان کی محبت کی قدر شناسی فرمائی، اسے سراہا، ان پر شفقت کا اظہار فرمایا، اور اپنے کو پورے اخلاص کے ساتھ ان کے اندر شامل بتایا، اور خود کو انھیں میں کا ایک فرد گردانا ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شدت تأثر سے رو پڑے اور ان کے دلوں سے گرد و غبار چھٹ گیا، اس طرح آپؐ کا کلام مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت کرنے کی ایک عمدہ و دلکش مثال ہے کہ گفتگو کے وقت اس کے حسب موقع طرز کلام استعمال کی جائے اور اس کے لئے مناسب کیفیات کے حامل الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔

مخاطب کا نفسیاتی پہلو اس سے گفتگو میں ایک اہم پہلو ہوتا ہے ضروری ہے کہ ہر داعی اور ہر مصلح اپنی دعوت کے کام میں اس کی رعایت کرے یہ چیز اس کے مقاصد دعوت کے لئے موزوں اور مقصود تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہے۔

ادب کی طاقت

ادب اسلامی نقطہ نظر سے نہ محض وعظ ونصیحت میں محدود ہے اور نہ محض عبادت ودعاء میں اور نہ محض تحریک ودعوت میں اور نہ محض لطف و تسکین ذوق میں، اسلام میں ادب تأثرات وجذبات کی ترجمانی میں ملتا ہے، زندگی کے نشیب وفراز کی حکایت میں ملتا ہے، وہ دوستوں کی محفل کا ساتھی ہے تو دشمنوں کے مابین معاملات کا گواہ ہے، وہ بروں کی برائی کی نشان دہی کرتا ہے اور اچھوں کی اچھائی بھی دکھاتا ہے، وہ اپنی خوش اسلوبی سے دلوں کو متوجہ کر لیتا ہے اور اپنی اثر پذیری سے دلوں کو موہ لیتا ہے، اس میں آدمی کو ایک دل پسند دوست اور ہم ذوق ساتھی کا سا لطف ملتا ہے، اور ہم جب اسلامی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ادب کی وسعت کو تنگ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ لباس کو گندہ نہ کیا جائے، اور اس لباس میں کہیں گندگی آجائے تو اس کو ہاتھ کے اشارہ سے بتایا جائے، اس سے چمٹ کر اپنے کو پراگندہ نہ کیا جائے، اسلام نے ادب کو اسی خوبی واحتیاط کے دائرہ میں رکھنا پسند کیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ہے اور اس کی رہنمائی میں رہتے ہوئے کام

کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کی، پھر جب آپؐ نے دیکھا کہ ان کے دل کھل گئے اور ان میں جو شکایتی اثر پیدا ہوا تھا وہ زائل ہو گیا اور وہ اپنی سابق صفائے قلب پر لوٹ آئے تو آپ نے انھیں ان کے ایمان کی قدر و قیمت اور قربانی و جانثاری میں ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ فرمایا، ان کے لئے دعا فرمائی، ان کی تعریف کی، اپنے لئے ان کی محبت کی قدر شناسی فرمائی، اسے سراہا، ان پر شفقت کا اظہار فرمایا، اور اپنے کو پورے اخلاص کے ساتھ ان کے اندر شامل بتایا، اور خود کو انھیں میں کا ایک فرد گردانا ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شدت تأثر سے رو پڑے اور ان کے دلوں سے گرد و غبار چھٹ گیا، اس طرح آپؐ کا کلام مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت کرنے کی ایک عمدہ و دلکش مثال ہے کہ گفتگو کے وقت اس کے حسب موقع طرز کلام استعمال کی جائے اور اس کے لئے مناسب کیفیات کے حامل الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔

مخاطب کا نفسیاتی پہلو اس سے گفتگو میں ایک اہم پہلو ہوتا ہے ضروری ہے کہ ہر داعی اور ہر مصلح اپنی دعوت کے کام میں اس کی رعایت کرے یہ چیز اس کے مقاصد دعوت کے لئے موزوں اور مقصود تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہے۔

ادب کی طاقت

ادب اسلامی نقطۂ نظر سے نہ محض وعظ و نصیحت میں محدود ہے اور نہ محض عبادت و دعاء میں اور نہ محض تحریک و دعوت میں اور نہ محض لطف و تسکین ذوق میں، اسلام میں ادب تأثرات و جذبات کی ترجمانی میں ملتا ہے، زندگی کے نشیب و فراز کی حکایت میں ملتا ہے، وہ دوستوں کی محفل کا ساتھی ہے تو دشمنوں کے مابین معاملات کا گواہ ہے، وہ بروں کی برائی کی نشان دہی کرتا ہے اور اچھوں کی اچھائی بھی دکھاتا ہے، وہ اپنی خوش اسلوبی سے دلوں کو متوجہ کر لیتا ہے اور اپنی اثر پذیری سے دلوں کو موہ لیتا ہے، اس میں آدمی کو ایک دل پسند دوست اور ہم ذوق ساتھی کا سا لطف ملتا ہے، اور ہم جب اسلامی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ادب کی وسعت کو تنگ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ لباس کو گندہ نہ کیا جائے، اور اس لباس میں کہیں گندگی آجائے تو اس کو ہاتھ کے اشارہ سے بتایا جائے، اس سے چمٹ کر اپنے کو پراگندہ نہ کیا جائے، اسلام نے ادب کو اسی خوبی و احتیاط کے دائرہ میں رکھنا پسند کیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ہے اور اس کی رہنمائی میں رہتے ہوئے کام

کرنا ادب کے بے بس کر دینے یا اس کی وسعت وتنوع کو نقصان پہنچانے کے مرادف نہیں ہے۔

ادب میں دلوں کو متوجہ کر لینے کی جو طاقت ہے اس کی وجہ سے مختلف زبانوں اور سوسائٹیوں میں اس سے جمہور وعوام کو متاثر کرنے کا کام بھی لیا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثالیں برے اور اچھے دونوں مقاصد کے لئے تاریخ میں ملتی ہیں، فرانس کے انقلاب میں روسو اور کمیونسٹ اور وولیٹر کے ادب کا کتنا بڑا حصہ ہے اور کمیونزم کو متعدد ملکوں کے عوام میں پسندیدہ بنانے میں کمیونسٹ ادیبوں نے ادب سے کتنا کام لیا؟ اور اس وقت بھی یورپ کی ثقافت وتہذیب کو عام کرنے میں مغرب زدہ ادب کی کتنی خدمات ہیں؟ اس سے اسلام کی تاریخ میں اصلاح ودعوت کے کاموں میں کتنی مدد لی گئی؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو ان کی قوموں میں جب دعوت واصلاح کے لئے بھیجا تو ان کو فصیح اللسان بنایا، فرمایا: ”وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم“ ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں (یعنی اس زبان میں بات کرنے کی صلاحیت کے ساتھ) تاکہ اوہ ان کے لئے واضح اسلوب میں بات کو رکھ سکے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ کو اپنی زبان میں کچھ دشواری کا احساس ہونے کی بنا پر اپنے پروردگار سے یہ عرض کرنا پڑا کہ میرے بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتے ہیں، ان کو میرا معاون بنا دیجئے۔ اور ان کی یہ عرض قبول ہوئی، اور ان کے بھائی کو بھی رسول بنا کر ان کے ساتھ کر دیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مؤثر ڈھنگ پر بات کرنے کی

بکثرت مثالیں ملتی ہیں، اور ادب کے متنوع پہلو ملتے ہیں، مثلاً گفتگو، خطابت، حکایت، نصیحت، دعاء، اظہار تأثر اور رعایت ذوق ادبی۔ ان سب اصناف سخن کی مثالیں حدیث شریف کی کتابوں میں چند در چند موجود ہیں، اور ان سے اس عہد کے لوگوں پر بڑا اثر پڑا۔ اور بہت سے لوگ ان کے اثر سے آپ کی طرف کھنچ کھنچ کر حلقہ بگوش اسلام بھی ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے اصحاب میں اور پھر تابعین پھر تبع تابعین اور بعد میں بھی آپ کے طریقہ کی نقل کی گئی، چنانچہ خلفائے راشدین اور ان کے بعد متعدد شخصیتیں پر اثر زبان و مؤثر کلام میں ممتاز ہوئیں، اور ان سے اصلاح ہوئی۔ اصلاح عوام کے سلسلہ میں سیدنا حسن البصری اور امام ابن جوزی کی مثالیں درخشاں ہیں۔

ادب اور زندگی

اسلام انسان کی فطرت کا پورا لحاظ رکھنے والا مذہب ہے، اس نے انسانی فطرت کے تقاضوں کو روکا یا بند نہیں کیا ہے، صرف اس کے راستے متعین کئے جاسکتے ہیں، یہ راستے خود انسان کی فلاح و بقاء کے ہیں، انسان کی فلاح و بقاء کے ان راستوں سے اپنے کو آزاد رکھنے میں فوری لذت و وقتی منفعت جو بھی حاصل ہوتی ہو، لیکن نتیجتاً وہ انسانی معاشرہ کی تباہی و بربادی یا خود اس سے گریزاں شخص کی تباہی کا سامان ہوتا ہے، چنانچہ دنیا کے جن معاشروں میں تمام قیود سے آزادی ہے، وہاں کا حال صرف خراب ہی نہیں بلکہ ہولناک خرابی کے دائرے میں آچکا ہے، آدھے ڈالر تک پر جان لے لی جاتی ہے، سماجی بندھن بکھرتے جارہے ہیں، آبروئیں لوٹی جاتی ہیں، اندرونی صحت برباد ہوتی ہے، اور یہ بربادی ایڈس تک پہنچتی ہے، یہ سب نتیجہ ہے زندگی کی ضروری احتیاطوں سے بھی آزاد ہوجانے کا جس کو فرد کی آزادی، ترقی پسندی اور تمدنی روشن خیالی کے ناموں سے اختیار کیا جاتا ہے۔

اسلام کی طرف سے اپنے ماننے والے پر ضروری احتیاط کی

پابندی خود اس کی مصلحت اور بقاء کے فائدہ میں ہے، اور ادب اسلامی بھی اس احتیاط کا لحاظ کرتے ہوئے تمام روا رکھی گئی وسعتوں میں کام کرتا ہے، ہمارا رابطۂ ادب اسلامی اسی احتیاط کے ساتھ جائز وسعتوں کا نہ صرف قائل ہے بلکہ عامل ہے اور ہمارا کاروان ادب اس کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔

یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد جو تحریکیں اٹھیں، وہ دراصل یورپین ممالک کے سیاسی و مذہبی حالات و سخت ظالمانہ طریق ہائے کار کا ردعمل تھیں، اور کسی چیز کے ردعمل میں منفی اثرات غالب ہوتے ہیں، چنانچہ یورپ میں اٹھنے والے ردعمل نے سیاسی نظام کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا، اور مذہبی دائرے کو تنگ کر کے گرجا کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا، اس کے بعد یورپ کے اہل فکر و ادب کا جو ذہن بنا، اسی کے لحاظ سے اس نے دنیا کے دیگر نظام ہائے حیات کو دیکھا، اس نے اسلام کو بھی مسجد کی چہار دیواری کے اندر بند کرنے کی کوشش کی، حالانکہ دونوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ یورپ نے رہبانیت کو اپنی اساس بنا رکھا تھا، جو کہ زندگی کے فطری تقاضوں سے جگہ جگہ ٹکراتی تھی، لیکن اسلام میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن ہمارے مغربی مفکرین صلیبی جنگوں کے اثر سے اپنے ذہنوں کو اتنا آزاد کر سکے نہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ رواداری اور غیر جانبداری کے ساتھ کر سکیں، پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ یورپ کے سیاسی و فکری و ثقافتی غلبہ نے مشرقی ذہنوں کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالا، حتی کہ بہت سے مسلمانوں کے ذہن بھی یہی سمجھنے لگے کہ اسلام میں بھی مذہب کا زندگی کی وسعتوں سے کوئی جوڑ نہیں ہے، حالانکہ یورپ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی خواہ سماجی پہلو ہوں یا سیاسی یا دیگر، جو گنجائش ہے، اس کو اسلامی شریعت کا ادنیٰ مطالعہ

کرنے والا بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اور اسلامی نقطہ نظر سے مذہب اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مابین جو علمی وابستگی ہے، وہ کسی واقف کار سے مخفی نہیں ہے، اسی لئے جب ہم ادب کے ساتھ ساتھ اسلامی کی نسبت اختیار کرتے ہیں تو تعجب پیدا کرنے والا کوئی کام نہیں کرتے، لیکن کچھ ذہنوں میں تعجب ابھرتا ہے، رابطہ ادب اسلامی اسی تعجب کے پیدا ہونے کے سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور وہ اپنی جدوجہد سے ادب اور اسلام کے درمیان جو علاحدگی کا غلط احساس ہے، اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔

ہم کو کسی بھی ادبی نمونے کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے تعین کے لئے اس کو ان وسعتوں اور احتیاطوں کے دائرے میں رکھتے ہوئے دیکھنا ہوگا کہ جو ہم کو اسلام کی طرف سے واضح رہنمائیوں میں بتائی گئی ہیں، وہ ادبی نمونہ جس قدر ان سے مطابقت رکھتا ہوگا اسی قدر اس کو اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح سمجھا جائے گا، اور جس قدر وہ ان سے گریزاں ہوگا اسی قدر اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے دور سمجھا جائے گا۔

مکہ کے ایک شاعر جو مذاہب کی تعلیمات سے واقفیت کے اثر سے جنت، دوزخ، آخرت، خدا اور اس کی رضا جیسے خیالات سے واقف ہو گئے تھے، اور اپنی شاعری میں ان کا تذکرہ کرتے تھے، لیکن اسلام سے ان کو ایسی ضد ہوئی کہ اس کی بری طرح مخالفت کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے رفیق سفر سے ان کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اور بار بار فرمائش کر کے سنتے رہے، پھر فرمایا: "آمن لسانہ و کفر قلبہ" ان کی زبان نے تو ایمان والی باتیں کہیں لیکن ان کا دل ایمان نہ اختیار کر سکا۔

اسی طرح ایک شاعر مسلمان ہوئے اور انھوں نے ایک نظم کہی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور شاعرانہ مضمون کے ساتھ اپنی بڑائی کا بھی تذکرہ کیا۔ یہ نظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خوش اخلاقی کے ساتھ سنا، اس نظم میں ایک شعر ایسا آیا جس میں تعلّی کا انداز حدودِ بشریت سے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شعر یہ تھا:

بلغنا السماء مجدنا و جدودنا

وا نا لنرجو فوق ذلك مظهرا

"کہ ہماری عزت وعظمت آسمان تک پہنچ چکی ہے، اور اب ہم امید کرتے ہیں کہ اس سے بھی آگے جائے گی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خدا تعالیٰ کے مقام سے گستاخی کا شبہ کرتے ہوئے ٹوکا، لیکن آپؐ نے اچھے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کہاں تک پہنچنے کا قصد ہے، اے ابولیلی (ابولیلی شاعر کی کنیت تھی) انھوں برجستہ جواب دیا کہ یارسول اللہؐ جنت تک۔ آپؐ اس جواب سے مطمئن ہوگئے کہ ان کے کلام میں شان خداوندی سے برابری دکھانے کی شوخی نہیں ہے۔ آپ نے ان کے اشعار خوش اخلاقی سے سنے پھر ایک شعر میں جو ایک شک پیدا کرنے والا مضمون محسوس ہوا، اس پر ٹوکنا ایک رہنمائی کا ذریعہ بن گیا، کہ شاعر کو فخر کرتے ہوئے کن حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کا جو ذہن بنایا تھا اور ان کے خیالات، امنگوں اور حوصلوں کو اس کے دائرے کا پابند کیا وہ ذیل کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ تھا کہ ایام جاہلیت کے اصولوں میں یہ بات تھی کہ اگر کوئی

اپنے خاندان کا یا اپنی پارٹی کا ہے تو وہ اچھا ہے، آنکھ بند کر کے تائید و مدد کا حقدار ہے، اور قابل محبت و تعلق ہے، لیکن اگر وہ مخالف خاندان کیمپ کا ہے تو خواہ حق پر ہو رواداری کا مستحق نہیں، چنانچہ یہ فقرہ محاورہ بن کر رائج ہو گیا تھا کہ اپنے آدمی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم، اسی کے مطابق جاہلیت کا شاعر کچھ لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے:

لایسألون أخاهم حین یندبهم
فی النائبات علی ماقال برهانا

''کہ یہ لوگ جب حوادث جنگ پیش آتے ہیں تو اپنے بھائی سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم جنگ میں شرکت کے لئے بلا رہے ہو تو کس بات پر جنگ ہے، یعنی آنکھ بند کر کے مدد کرتے ہیں۔''

اور ایک شاعر کہتا ہے:

وما أنا الا من غزیة
ان غویت وان ترشد غزیة أرشد

''کہ میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں وہ خراب کام کریں گے تو میں بھی خراب کام کروں گا، وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کام کروں گا۔''

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت و انصاف پسندی کی تعلیم دیتے ہوئے اس ذہنیت سے منع فرما دیا، اس طرح مسلمانوں کے لئے یہ رائج فقرہ ناقابل قبول ہو گیا، لیکن کچھ عرصہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فقرہ استعمال فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم، صحابہ کرامؓ کا چونکہ آپ ذہن بدل چکے تھے، انھوں نے فوراً سوال کیا کہ یا رسول اللہ!

مظلوم کی مدد کرنا تو ہم سمجھتے ہیں لیکن ظالم کی مدد کیسے ہوتی ہے۔؟ تو آپ نے فرمایا: ظالم کی مدد اس طرح ہوتی ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اس طرح آپ نے اسلامی ذہن کے لئے وہ حدود بتادیئے جہاں تک مسلمان جاسکتا ہے اور جہاں سے اس کو آگے نہ بڑھنا چاہئے۔

مسلمان کو خواہ ادیب ہو خواہ شاعر ہو ان سرحدوں کا جاننا ضروری ہوگا، اور ان کی پابندی کرنا ہوگی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جن کو آپ کی توجیہات و رہنمائی ملی تھی، شاعر بھی تھے، اور ادیب بھی، وہ اسلام کی بتائی ہوئی وسعتوں ہی میں اپنے ادب و شاعری کو چلاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو اجازت بلکہ تائید حاصل رہتی تھی، ان کی شاعری کی وسعتوں میں مدح بھی تھی اور مرثیہ بھی، غزل بھی تھی اور ہجو بھی، واقعہ بیانی بھی تھی اور احساسات کا اظہار بھی، لیکن ان سب میں رعایت تھی انسانی قدروں اور اسلام کی حدوں کی، ان کی اس احتیاط کو اس عہد کے مقتدر اسلامی شاعر حسان بن ثابت الانصاریؓ کے اس جملہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر کہا جب قریش کے بعض ایسے افراد کی طرف سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے، آپ کی ہجو کا جواب دینے کے ارادہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا کہ تم ان لوگوں کی مذمت کیسے کروگے جب کہ میں خاندانی طور پر انھیں میں سے ہوں، اس پر انھوں نے کہا کہ آپ کو میں ان میں سے ایسا نکال لوں گا جیسے گیلے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔

اچھی اور مؤثر زبان میں مختلف رعایتوں کے ساتھ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کی ہجو کی اور خوب کی اور انھوں نے اپنے

ایک دوسرے شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

فان أبی و والدہ وعرضی

لعرض محمد منکم و قاء

"بلاشبہ میرے باپ اور میرے دادا اور خود میری آبرو، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے ساتھ تمہارے حملہ کو روکنے کے لئے سینہ سپر ہیں۔"

انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع اور ان کے بدخواہوں کی بدخواہی کے مقابلہ کے لئے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو خوب خوب استعمال کیا اور اپنے فنی ہنر کا اظہار کیا، انھوں نے اپنی شاعری میں رو پیدا کرنے کے لئے غزل کی اصطلاحیں اور تعبیریں بھی فصاحت وجدت طرازی کے ساتھ استعمال کیں، اور چونکہ وہ معقول حدود سے باہر نہ تھیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، بلکہ ہمت افزائی فرمائی، بلکہ ایک موقع پر آپ نے یہ فرمایا کہ اسلام کی نصرت تلوار اور نیزے سے کی جاتی ہے شعر وشاعری سے بھی کی جانا چاہئے۔ حضرت حسانؓ اپنی اس نعت گوئی کی بنا پر شاعر اسلام اور شاعر الرسول کہلائے۔ اشعار کے اندر جذبہ احساس وتاثر کی جو ترجمانی ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اس کے صحیح انداز میں پورا محسوس کرتے تھے۔

اس کی مثال وہ اشعار ہیں جو آپؐ کے قریشی عزیز کو ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بناء پر ان معافیوں میں شامل نہ کئے جانے پر جو فتح مکہ کے موقع پر عام طور پر دے دی گئی تھیں، قتل کر دئے جانے پر ان کی بہن نے کہے تھے اور ان میں آپ کو مخاطب کر کے رنج والتجاء کا مؤثر انداز اختیار کیا

تھا، ان کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تأثر کا اظہار فرمایا کی یہ اشعار اگر پہلے سنے ہوتے تو رعایت کر دیتے۔

نثر کا دائرہ قرآن مجید نازل ہونے سے قبل عربوں میں بہت محدود تھا، قرآن مجید کے اثر سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ وسیع ہوا، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی ادبیت کا اظہار ہوا۔ آپ اس میں تمام دیگر عربوں کے لئے معلم و رہبر نظر آتے ہیں، آپ کی تقریریں، گفتگوئیں، تذکرے، اظہار تأثر، دعائیں و مناجاتیں عربی کا بہترین ذخیرۂ ادب ہیں، اور آپؐ کے زمانہ کے بعد نثر پر آپؐ کے ادب کی نمایاں چھاپ ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقسام کلام میں بھی آپؐ کے یہاں تنوع ملتا ہے، مثلاً زن و شو کے آپسی تبصروں پر بھی ایک گفتگو آپؐ کے اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ کے درمیان ہوئی تھی، جو آپؐ نے بیان فرمائی اور وہ حدیث میں محفوظ ہے، اس میں خاص گوشہء ادبی کی بھی نمائندگی ملتی ہے، یہ حدیث ام زرع کے نام سے موسوم ہے۔

بہر حال اسلامی ادب کو ایک محدود و مجبور ادب محسوس کرنا صحیح نہیں ہے، اسلام کو صرف عبادت اور ترک دنیا کا مذہب سمجھنے والے ہی ایسا سمجھ سکتے ہیں، لیکن جو اسلام کو زندگی کی وسعتوں کا دور تک ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اس کے مجبور و مقید سمجھنے کی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے۔

چنانچہ ادب کی اسلامی وسعتوں کے دائرہ میں وہ تحریر و کلام بھی آتا ہے جو کسی دینی تحریک سے وابستہ یا کسی مذہبی تصور کا حامی ہوتے ہوئے ادبی خصوصیات سے بھی متصف ہو۔

اردو زبان کے شعر و ادب کی زبان بننے کے کچھ مدت بعد ہی سے

اس کے لوگوں کو سماجی اور ملکی سطح پر ابتری کے حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ان کے ادب وشاعری کو ایسے ماحول سے سابقہ پڑنے لگا کہ جس میں ایک طرف سماجی مفاسد واخلاقی زوال کے حالات تھے اور دوسری طرف سیاسی میدان میں غیر ملکی طاقت کا اثر ورسوخ اور ملک کی سیاست وحکومت پر اس کی ظالمانہ گرفت بڑھتی جارہی تھی جو بے چینی اور بے کیفی پیدا کررہی تھی، اور مختلف قسم کی زیادتیوں اور حق تلفیوں کو جنم دے رہی تھی، یہ حالات اس عہد کے ادب وشاعری کے لئے اہم موضوع تھے، اور ان کو ادب وشاعری نے اپنایا۔ اس سے قبل کے دور کی شاعری رنگ وبو اور درد وکسک کی حامل رہی تھی جو غزل کے روپ میں احساسات وتأثرات کی جھلک پیش کرتی رہی، اس میں وارداتِ عشق اور حکایت درد ملتی ہے، اور اس میں جہاں اشاروں کی ضرورت ہوئی وہاں گل وبلبل اور چمن وصیاد کی آڑ میں بات کہی گئی، بعد کے عہد میں غزل کے خیالات بھی بدلے، غزل کے پہلو بہ پہلو نظم تھی جس میں تعمیری پہلو اختیار کیا گیا، اور مقصود ترجمانی کی گئی۔

مثبت انداز اختیار کر لینے پر شاعری کا ذہنوں کو بیدار کرنے اور فرد وقوم کا اچھا برا محسوس کرانے میں بڑا رول رہا ہے، اس میں شعر کے فنی تقاضوں کا حق بھی ادا ہوتا تھا، اور جدت وتنوع کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا، اس نے قومی وملی سطح پر اچھا تعمیری فرض انجام دیا، اس سلسلہ میں ایک طرف حالی اور شبلی کے یہاں ماضی وحال کے آئینہ میں قوم کی حالت کی تصویر کشی ملتی ہے، اکبر الہ آبادی کے یہاں نصیحت آموز تنقید وطنز اور مولانا ظفر علی خان کے یہاں ملی عظمتوں کی یاد اور اس کی سربلندی کی ترجمانی ملتی ہے، دوسری طرف علامہ اقبال کے کلام میں اسلام ومسلمانوں کا مقام بلند اور اس

کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا بلند معجزانہ تصور بڑے مؤثر اور فنکارانہ انداز میں ملتا ہے، اسی طرح کیطر زکلام کا انداز مولانا آزاد کے نثری ادب میں نمایاں نظر آتا ہے، اس عہد کے نثری ادب میں ایک طرف قوت خطابت نے ذہنوں اور طبیعتوں میں حوصلہ اور جوش پیدا کیا، دوسری طرف قصہ وحکایت نے اپنا مؤثر رول ادا کیا، اس میں تاریخی ناول اور سماجی حیثیت کے حامل افسانے نمایاں رہے، سوانحی ادب اور تذکروں نے علیٰحدہ اپنا رول ادا کیا۔

اس مذکورہ بالا ادب نے برصغیر کی مسلم قوم کی جو اردو زبان وادب سے وابستہ تھی، ایک بلند نظر و باہمت قوم کی حیثیت سے تربیت وتشکیل میں عظیم کردار ادا کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک وقت ایسا بھی گذرا کہ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے متاثر ادیبوں کی ایک جماعت ترقی پسند مصنفین کے نام سے کمیونسٹ نظریہ کی خدمت میں سرگرم عمل ہوئی، اس نے اگرچہ ایک اچھے پہلو کو اجاگر کیا کہ کمزور طبقات کی طرف توجہ دی جائے اور ان کے غم وآلام کو سمجھا جائے اور اس کے مداوے کی فکر کی جائے۔ لیکن دوسری طرف اخلاقی اور مذہبی قدروں کو بالکل بے اثر بلکہ زائل کر دینے کا کام بھی کیا، ان کی شاعری نے الحاد کے بیج بونے میں حصہ لیا، اور ان کے افسانوں نے اخلاقی انارکی کے ذوق کو ہوا دی، جس کی بے شرمی "لحاف" تک پہنچی۔ ادب کے اس منفی بلکہ تخریبی پہلوؤں کا توڑ کرنے کے لئے صالح ادب کے حاملین آگے آئے، ان میں جماعت اسلامی کے ادباء پیش پیش رہے، اور اس سلسلہ میں ان کی خدمات قابل ستائش ہیں، ان کا ادب تعمیری پہلو کا حامل رہا، البتہ یہ پہلو بعض بعض وقت ایک مخصوص رنگ اختیار کر گیا، جس سے وسیع مقبولیت کے اس کے حق کو نقصان پہنچا، بہر حال اسلامی ادب کی

ان کوششوں نے بہت سے ذہنوں اور احساسات کو ایک طرف اسلام سے وابستگی عطا کی اور دوسری طرف ادب کی بزم میں نئے عنصر کا اضافہ کیا جو فنی بنیاد پر وقیع حیثیت کا مالک ہے۔

تاریخ اور ادب

(۱)

ادب کا زندگی کے ساتھ گہرا ربط ہے بلکہ زندگی کے اندر ابھرنے والے تاثرات، حالات اور کیفیات کا اصل مظہر ادب ہی بنتا ہے۔ اس طرح ادب امیر کے محل میں بھی ظہور پذیر ہوتا ہے اور غریب کے جھونپڑے میں بھی وجود پاتا ہے، لیکن قابل حصول اس وقت ہوتا ہے جب اس کو رکارڈ کرلیا جائے اور محفوظ کرلیا جائے، اس طرح دوسروں کو بھی اس سے واقف ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوجاتا ہے۔ اور یہ عمل بہت کم مقدار میں ہی انجام پاتا ہے، اسی لئے ادب کی محفوظ مقدار اصل مقدار کے مقابلہ میں بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ یوں ہر طرح کی سوسائٹی میں اس کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اگر سوسائٹی مہذب اور شائستہ ہوتی ہے اور اس میں ظہور پذیر ہونے والے ادب کو رکارڈ کر کے محفوظ کرلیا جاتا ہے تو وہ ادب اس سوسائٹی کے تصورات و احساسات کا غماز بنتا ہے اور اس میں سوسائٹی کی زندگی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ عرب ان پڑھ تھے، اور اپنے اردگرد کی تہذیبوں سے کٹے ہوئے غربت کی ماری زندگی گزار رہے تھے، وہ جو بولتے اور کہتے تھے اس میں ان کے فطری احساسات و

تاثرات ان کے ادب میں ڈھل جانے سے اب تک چمکتے نظر آتے ہیں۔ عربوں کو اپنے ایسے کلام سے جس میں ان کی زندگی کے احساسات کی ترجمانی ہوتی تھی بڑی دلچسپی تھی، ان کی یہی دلچسپی ان کے اس کلام کے گرفت میں آجانے کا ذریعہ بنی اور اس طرح ان کے زمانۂ جہالت کا کلام بھی ادب بن کر خاصا محفوظ ہوگیا۔ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا نثری کلام زیادہ محفوظ نہ ہوسکا، لیکن شعروشاعری سے ان کی دلچسپی کام آئی اور وہ اچھی خاصی مقدار میں محفوظ ہوگئی اور آج تک ادب کی تاریخ میں اس کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ادب صرف پڑھے لکھوں کا سرمایۂ تصور واحساس نہیں ہوتا ہے، یہ غیر تعلیم یافتہ افراد میں بھی ملتا ہے، البتہ ان میں اس کے لئے تصور واحساس کی صلاحیت کے ساتھ اپنی بات کے ادا کرنے کے لئے مطابق حال الفاظ اور جملے بھی ہونا ضروری ہے اور یہ الفاظ اور جملے عموماً ہر ایک کو اپنی سوسائٹی میں آپسی بات چیت اور تبادلۂ خیال سے حاصل ہوجاتے ہیں، اور ادب کے وجود کے لئے ان الفاظ اور جملوں کا حساس مواقع پر استعمال کافی ہوتا ہے۔

انسانی تاریخ پر اگر ہم اس زاویۂ نظر سے غور کریں تو ادب کے وجود کا ہر دور میں ہونا ضروری ہوجاتا ہے، خواہ وہ ہم تک پہنچا ہو یا سرے سے گرفت ہی میں نہ آیا ہو اور ظاہر ہے کہ ہر ادب کو گرفت میں لانا اور محفوظ کرلینا آسان نہیں، خاص طور پر نثر کو یاد کرنا اور یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا، البتہ شاعری کے لیے اس کی سہولت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے غیر تعلیم یافتہ عہد کے لوگوں کا ادب جو زیادہ محفوظ کیا جاسکا ہے، وہ شعری ادب ہے، لیکن تعلیم یافتہ عہد میں ذرائع تحریر ونقل کی وجہ سے نثری ادب کو بھی محفوظ کرلینے کا موقع

زیادہ حاصل ہوا۔

انسانی تاریخ میں ادیبوں کے تذکروں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان میں یہ باکمال لوگ وہی لوگ ہیں جن میں انسانی حالات اور زندگی کی کیفیات کو محسوس کرنے کا سلیقہ زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ رائج الوقت الفاظ اور محاذوں سے واقفیت بھی ضرورت کے مطابق رہی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو اپنی حساس نظر میں لاتے اور ان کو موزوں و مناسب الفاظ اور جملوں میں ادا کر دیتے تھے، یہ ایسے صاحب صلاحیت لوگ اگر اچھے ہوتے تو ایسے ہی احساسات کے ترجمان بنتے تھے، اور دراصل یہی لوگ ادب کے وجود کا اصل درجہ بنتے ہیں، ورنہ ادب کا اچھا یا برا ہونا مفید یا مضر ہونا، دلچسپ یا بدمزہ ہونا خود اس کی ذاتی صفت نہیں ہوتی، وہ حقیقت میں صاحب ادب کی صلاحیتِ احساس وصلاحیتِ ترجمانی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

انسان کی اس ادبی صلاحیت کا عمل دخل اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی صلاحیت کا کوئی جزء خالص ادبی موضوعات سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع کو اگر اپنی ترجمانی کے لئے اختیار کرتا ہے۔ تو اس میں بھی ادب کی کچھ نہ کچھ کیفیت شامل ہوجاتی ہے، خواہ وہ موضوع دینی ہو یا علمی ہو۔ چنانچہ کتنے ایسے مضامین ہیں جو اصلاً مذہبی و دینی ہیں، لیکن ادبی نثر کے حامل ہیں، اور کتنے مضامین ایسے ہیں کہ وہ اصلاً علمی ہیں، لیکن ادب کی چاشنی اور اثر سے خالی نہیں ہیں۔ لہٰذا ہر مذہبی کلام کو ادب کے دائرے سے خارج سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح ہر علمی کام کو ادب ناشناس قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

علم وادب کے امتزاج کو تاریخ جیسے موضوع میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، تاریخی حالات کو محسوس کرنے پھر ان کو بیان کرنے میں مؤرخ کے لئے اپنے احساس تأثر سے بالکل جدا ہوجانا یا اپنے حسن ادا کی صلاحیت کو چھوڑ دینا آسان بلکہ پوری طرح ممکن نہیں، لہٰذا تاریخ میں ادب کی جھلک کم وبیش مقدار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تاریخ کے ساتھ ادب کے امتزاج کے سلسلہ میں ایک بڑا اشکال تاریخ کے غیر معروضی ہوجانے کا ہوتا ہے کہ اس میں ادبی رنگ آجانے سے وہ اپنے اصل مقصد وطریقہ سے ہٹ سکتی ہے۔

یہ اشکال اپنی جگہ پر صحیح ہوسکتا ہے لیکن تاریخ کے سرمایہ کو دیکھو کہ خواہ وہ مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا ہو حتیٰ کہ مغربی مؤرخین کا پیش کردہ سرمایہ بھی اگر اس کسوٹی پر رکھا جائے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکلیہ معروضی نہیں ہے۔ اور غور کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تاریخ بالکلیہ معروضی نہیں ہوسکتی کیونکہ لکھنے والا کتنا ہی معروضی ہو وہ اپنے احساس وتصور سے مطلقاً خالی نہیں ہوتا، مغربی مصنفین نے اسلام اور رسولؐ اسلام کے متعلق جو لکھا ہے اس میں جگہ جگہ اپنا احساس وتصور اس طرح پیش کردیا ہے کہ حقائق کی شکل بدل گئی ہے، جس کی رو سے اسلام کے تاریخی واقعات ایسا تصور دیتے ہیں کہ جو اسلام سے برگشتہ بنادیتا ہے اور اسلامی شخصیتوں کی شبیہ بگاڑ دیتا ہے لیکن مسلمان مؤرخین اگر اسلامی شخصیتوں کی شبیہ کو ان کی حقیقت کے مطابق اچھی بنا کر پیش کریں تو ان پر غیر معروضی ہونے کا الزام لگ جاتا ہے۔ یہ زیادتی کی بات ہے۔ واقعات کے ساتھ ان کے بیان کرنے والے کا تأثر جھلکنا کوئی بری بات نہیں لیکن یہ اس طرح ہونا چاہئے کہ واقعات کی اصلیت

مجروح نہ ہو اور حقائق میں تبدیلی نہ آئے اور اس کے برعکس تصور نہ پیدا ہو، تاریخ لکھنے والے کا احساس تاثر اس کی تحریر سے جھلکنا فطری بات ہے، لیکن اس حد تک اس کو معروضی بھی ہونا چاہئے کہ حقیقت باقی رہے۔ تاریخ کے موضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو اس کی حقیقت کی حفاظت کے ساتھ سامنے لایا جائے اور ادب کی آمیزش صرف چاشنی کے طور پر اور بیان کرنے والے کے انسانی احساس کی ہلکی شرکت کے ساتھ ہو تو وہ اپنے مقصد اور افادیت سے محروم نہیں ہوگی بلکہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے افادیت کے ساتھ خوش ذائقہ موضوع ثابت ہوگی۔

تاریخ کے موضوع میں لطف اور چاشنی دراصل اس میں ادبی انداز کی قدرے آمیزش سے ہی آتی ہے، لیکن اس کی آمیزش کی مقدار اور رنگ کی کمی بیشی پر اس کی قیمت و اعتبار کا انحصار بھی ہوتا ہے۔

تاریخ اور ادب

(۲)

تاریخ کا فن انسانی معاشرہ کو اس کے ترجیحی راستہ کی طرف رہنمائی کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ اس انسانی زندگی کو اس کی مطلوبہ قدروں کا پابند بنانے میں عموماً مدد کی ہے، اور اس طرح انسانی سوسائیٹیوں میں ان کے اختیار کردہ طور طریق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ذہنی اور شعوری لحاظ سے بڑی حد تک اپنے آباواجداد سے جڑا ہوا ہوتا ہے، اور انسانوں کی بعد میں آنے والی نسلیں اپنے تحت الشعور میں اپنی سابقہ نسلوں کی نقل کرنے اور ان کے راستہ پر چلنے کا شوق رکھتی ہیں، اور اگر اپنے زمانہ کے حالات واثرات کے دباؤ سے ایسا نہیں کر سکتی ہیں، تو بھی اپنے اسلاف سے تعلق کا احساس ضرور رکھتی ہیں، اور ان کے طریقوں کو محبت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، بلکہ ان کو اپنے لئے مثالی نمونہ سمجھنے کا جذبہ رکھتی ہیں، قرآن میں انبیاء کا اپنی قوموں کو دینی واصلاحی دعوت دینے کے سلسلہ میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے کہ قوموں کے افراد نے جواب دیا کہ تم ایسی باتیں کہتے ہو جو ہمارے باپ دادا میں نہیں پائی جاتی تھیں، اسی طرح کے

احساسات کا نتیجہ تھا کہ انسانی رجحانات اور طور طریق کا کچھ نہ کچھ حصہ پرانی نسلوں سے نئی نسلوں کو منتقل ہوتا رہا ہے، عسکری مزاج کے اسلاف کی اولاد میں عسکری صفات اور ذہنی صلاحیتوں کی نسلوں میں ذہنی صلاحیتیں اگر پوری طرح نہیں ہوتیں تو بھی اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور منتقل ہوتے ہیں، چنانچہ آرین نسلوں میں اپنا الگ مزاج ملتا ہے، سامی نسلوں میں علاحدہ خصوصیات ملتی ہیں، اور اپنے آباء پر فخر کا جذبہ تو ملتا ہی ہے۔

تاریخ کے واقعات سے انسان کے شعور اور تحت الشعور میں پیدا ہونے والے احساسات کو پیغام ملتا ہے، یہ پیغام ان کو ایک مخصوص رخ دینے میں مدد کرتا ہے اور ان کی بنا پر بعد کی نسلوں کو اپنی سابقہ نسلوں میں برتری محسوس ہوتی ہے اور ان پر فخر کرنے کا احساس ان میں پیدا ہوتا ہے، اور اگر ان میں قابل فخر باتیں بالکل نہیں ہوتی ہیں تو ان کے بعد کی نسلوں کو اپنے تحت الشعور میں ایک طرح کی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ شرمندگی بعض وقت ان میں اپنے اسلاف کے لئے فرضی کارنامے بنا لینے تک پہونچا دیتی ہے، اور ان کے اعلیٰ کردار کے جھوٹے قصے گڑھ لیتی ہے۔

یہ بات تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی قوم کی تاریخ میں قابل فخر کارنامے نہیں ہوتے یا اس کی تاریخ اس کے اسلاف کے کارناموں کو محفوظ نہیں کر سکی ہوتی ہے ایسی صورت میں اپنی خواہشات کو تاریخ کی شکل دے کر قابل فخر بنا لیا جاتا ہے، اور اس طرح تاریخ نویسی کو تاریخ سازی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

یہ عمل نہ صرف یہ کہ دھوکہ دہی اور فریب کا عمل ہے، جس سے صرف ایک محدود اور وقتی فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے لیکن بالآخر اصحاب تحقیق و جستجو

حقائق کا پتہ چلا کر حقیقت حال کا انکشاف کر دیتے ہیں، تو غلط کاری پر پانی پھر جاتا ہے۔

بہر حال تاریخ کو حقیقت نواز اور دیانت دار لوگ جب مرتب کرتے ہیں تب ہی وہ نئی نسل کو صحیح رہنمائی دے سکتی ہے، پھر ایسی تاریخ انسانی معاشرہ کی کثیر منزلہ عمارت کی تعمیر میں مدد کرتی ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ نگاری میں دیانتداری خالص مشینی انداز کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اپنا فریضہ ان الفاظ اور عبارتوں کے ذریعہ انجام دیتی ہے، جو لکھنے والے یا بیان کرنے والے کے شعور اور تحت الشعور کی غمازی کرتے ہیں، اور اس سے واقعہ بیانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ کا ادب سے ملاپ ہوتا ہے۔ لیکن اس ملاپ میں اس بات کا لحاظ ضروری ہوتا ہے کہ سمجھا جائے کہ اس ملاپ کے حدود کیا ہیں، یا کیا ہونا چاہئیں، اس کے حدود کم از کم ضرور یہ ہوں گے کہ واقعات بیانی میں حقائق بدل نہ جائیں یا ان کی ترجمانی غلط نہ ہو، واقعہ بیانی اس طرح ہونا چاہئے کہ حقائق نہ بدلیں، اور نہ ایسی ترجمانی ہو کہ حقیقت کچھ کی کچھ نظر آئے اگر ایسا ہوتا ہے تو نئی نسل کو غلط لائن دینے اور اس کے خلاف واقعہ تصور دینے کے مرادف ہوگا۔

لیکن بہر حال تاریخ کا ادب سے رشتہ نا قابل انکار ہے، کیونکہ کوئی بھی شخص واقعہ بیانی یا واقعہ نگاری میں اپنے شعور اور تحت الشعور کی کیفیات سے مطلقاً آزاد نہیں ہو سکتا ہے، وہ صرف مشین یا کمپیوٹر نہیں ہے۔ پھر تاریخ بیانی کے مقصد میں اور ادب کے مقصد میں بعض موقعوں پر اشتراک بھی ہو جاتا ہے مثلاً کسی واقعہ سے نصیحت یا عبرت حاصل کرنا ہے تو اس کے

لئے سپاٹ یا خشک طریقہ سے واقعات بیان کرنے سے کام نہیں چل سکتا، اس کے ساتھ کچھ ادبی پیمانوں سے بھی مدد لینا ہوگا، ہاں واقعات کو جب بجنسہٖ ذہنوں میں بطور معلومات بٹھانا ہو تو ادبی تعبیرات وطریقۂ بیان سے گریز کرنا ہوگا، بہر حال ادب کے تاریخ کے ساتھ شریک عمل ہونے کا مسئلہ خاصی نزاکت رکھتا ہے اور بڑی احتیاط کا متقاضی ہے، دراصل اس میں موقع ومحل اور مقصد عمل وصدق گوئی تینوں کا لحاظ ضروری ہے۔

تاریخ کے ادب کے ساتھ ربط ہونے ہی کے اثر سے شعر میں مثنوی، شاہنامے وجود میں آئے، اور صنف نظم میں ادب نے تاریخ کا دامن پکڑایا تاریخ نے ادب سے مدد لی، نثر کے میدان میں بھی تاریخ وادب جگہ جگہ ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اور جگہ جگہ ایک دوسرے سے دور بھی ہو جاتے ہیں، مشہور شخصیات کی تاریخ، مشہور مقامات کی تاریخ، اور اس طرح متعدد دوسری اصناف تاریخ میں ادب کی محتاط شرکت یا معاونت صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

دراصل باشعور اور صاحب احساس انسان کا کوئی کام اس کے ذاتی اور نفسیاتی تأثر کے سایہ سے باہر نہیں رہ پاتا اب یہ الگ بات ہے کہ اس کا تناسب اور صحیح مقدار کیا ہونا چاہئے، اور کون سی مقدار تاریخ کے منصفانہ رویہ کو مجروح نہیں کرتی، اور کون سی مقدار تاریخ کو اس کا اپنا فرض ادا کرنے سے مانع بن جاتی ہے، اس کو صاحب قلم تاریخ وادب دونوں کے مقاصد و خصوصیات سے سمجھتا اور انجام دے سکتا ہے۔

تاریخ اور ادب

(۳)

تاریخ کے کام کو علمی دیانت کے ساتھ لیکن انسانی احساس وفکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور قارئین کی ضرورت کے مطابق پیش کیا جائے تو وہ ایک تعمیری اور اصلاحی کام بن جاتا ہے، گزشتہ زمانوں میں اس سے انسانوں کی ذہن سازی کا خاصا کام لیا گیا ہے۔

تاریخ کے فن کی ذیلی شاخوں میں ملکوں کی تاریخ، قوموں کی تاریخ، تہذیبوں اور تمدنوں کی تاریخ، اہم اور تاریخ ساز شخصیات کی تاریخ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اقسام زیادہ تر ثقافت اور معلومات کی ضرورت کو پورا کرتی ہیں، لیکن شخصیات کی تاریخ سے عموماً انسانوں کی شخصیت سازی کا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے، اور یہ مقصد دیگر مقاصد کے مقابلہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اہل دنیا کو اس کی فکر کم ہوتی ہے، لیکن اسلامی فکر ونظر کے تحت اس مقصد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ اس فکر وذہن کے مصنفین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اور مثالی شخصیت سے شروع کرتے ہوئے علماء حق، صلحاء امت اور اولیاء کرام ومفکرین عظام،

مجاہدین اسلام اور عظیم تاریخ ساز قائدین کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اہم شخصیات کو پیش کرنے میں اگر خالص منطقی اور علمی انداز اختیار کیا جاتا ہے تو وہ ادب کے موضوع سے کافی حد تک باہر ہو جاتا ہے، اس کے نتیجہ میں اس کے پڑھنے میں وہ کشش اور پسندیدگی نہیں ہوتی جو ادب کی جاذبیت رکھنے والے کام کو حاصل ہوتی، اور پھر اس سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو انسان سازی کے مقصد کے لئے مطلوب ہے۔

ہمارے صدر رابطہ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے تعلیمی آغاز میں ادب کا مطالعہ ایسی توجہ سے کیا تھا کہ ان کے اسلوب تحریر میں اس کی رعنائی سرایت کر گئی اور ان کے علمی وفکری مطالعہ سے جو ان کا علمی مقام بنا اور اس کے بموجب انھوں نے جو تحریری کام لیا اس کو مولانا کی تحریر کی مزید خصوصیت اور امتیاز سمجھا جاتا ہے، مولانا نے جن موضوعات کو اپنی تصنیف وتالیف کا موضوع بنایا ان میں شخصیات کی تاریخ کا موضوع زیادہ وسیع طریقہ سے پایا جاتا ہے۔اور اس میں مولانا کا اسلوب تحریر ادب کی تأثیر کا خاصا حامل ہے۔

مولانا کی علمی وفکری تصنیفات میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے، لیکن تاریخ چونکہ عمومی سطح پر ادب کے دائرہ میں آتی ہے اس میں مولانا کا قلم خاصا ادبی جاذبیت رکھتا ہے، اور خاص طور پر جب زیر تذکرہ ایسی شخصیت ہو جو مصنف کے دل کو متأثر کرتی ہو، مولانا نے شخصیات کے سلسلے میں خاتم الرسل محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے لے کر مفکرین اسلام وصلحاء عظام تک چند در چند شخصیات کو پیش کیا ہے، اور ان کے باکمال حالات کو اپنے پرتاثیر قلم سے قارئین کے دل ودماغ کے لئے پسندیدہ اور محبوب بنا دیا ہے۔

زبان وادب کا تعلق ثقافت و مذہب سے

ہر انسان کی زبان اس کی زندگی کے تقاضوں اور محسوسات کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی کے تقاضے اور محسوسات اس کے ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں، اس طرح کسی بھی قوم کی زبان اس کی ثقافت اور مذہب کی بھی آئینہ دار بن جاتی ہے، انسانی زندگی کے یہ دونوں پہلو یعنی مذہب اور ثقافت انسانی زندگی سے اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے علاحدہ نہیں کئے جاسکتے، یہ کمزور پڑ سکتے ہیں، لیکن ختم نہیں ہوتے، ثقافتی پہلو اپنی مختلف اور متنوع شکلوں میں ہر قوم وملک میں عیاں ملتا ہے اور مذہبی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ بھی ہر قوم وملک کے افراد کی زندگی میں ملے گا، دین دار تو دین دار ہے، وہ ملحد شخص کے یہاں بھی مل جاتا ہے، ملحد کے یہاں وہ اس کے دینی وقلبی تردد میں ملتا ہے جو مذہب کے انکار سے پیدا ہونے والے خلاء کے احساس کو دبانے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بعض ملحد لوگ اس دینی کشمکش کے دباؤ میں ایک دن بالآخر مذہب کی ضرورت کے سامنے جھک جاتے ہیں، اور بعض ملحد اسی کشمکش میں رہتے رہتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، بہر حال ثقافت اور مذہب کے

اثرات کسی قوم میں جس طرح کے اور جس مقدار میں بھی ہوں اس قوم کی زبان کی تعبیر وطرز ادا میں جھلکتے اور نمایاں ہوتے ہیں، بلکہ زبان کے متعدد الفاظ اور محاورے اول، ثقافت اور مذہب کے مطالب کے ظاہر کرنے کے لئے وضع ہوتے ہیں پھر وہ عام استعمال میں دیگر مطالب کے لئے بھی رائج ہوجاتے ہیں، اور اس طرح بھی زبان کا دائرہ بتدریج وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی سے زبان اپنی قوم کے احساسات وتاثرات کی بھی ترجمان بنتی ہے، اور زبان کے بہت سے محاورے ان احساسات وتاثرات کی ترجمانی کا ذریعہ بنتے ہیں، اور وہ ایک طرف زبان کی زرخیزی اور وسعت کا باعث ہوتے ہیں، دوسری طرف وہ انسان کے تصورات واحساسات کو اچھے اور سچے ڈھنگ سے ادا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، زبان سے ثقافت ومذہب کا ایسا قدرتی تعلق وربط ہونے کی صورت میں کسی بھی قوم کو اس قوم کی ثقافت ومذہب سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا، چنانچہ کسی ایسی زبان کو جو کسی قوم کی زندگی کی ترجمان بن چکی ہو، نظر انداز کرکے اس کی طاقت اور روح کو ختم کردینا دراصل اس قوم کے تشخص اور خصوصیات کو ختم کردینا ہے، جس کی وہ زبان ہے، اگر اس کو دبا کر دوسری قوم کی زبان کو زبردستی غالب بھی کردیا جائے تو یہ دراصل ایک قوم کو اس کے اصل جامہ زندگی کے بجائے دوسری قوم کا جامہ زندگی پہنا دینا ہوگا، اس طرح زبان کی تبدیلی قوم کی زندگی کے خدوخال کی تبدیلی بن جاتی ہے۔ البتہ کسی زبان کی تبدیلی اگر خود مرور زمانہ اور حوادث روزگار کے اثر سے ہو تو وہ تبدیلی تبدیلی نہیں بلکہ زبان کی وسعت وترقی کا باعث ہوتی ہے، اور یہ اس قوم کے احساسات وتصورات کے بتقاضائے وقت بدلنے اور بڑھنے کی علامت ہوتی ہے۔

اردو کے ساتھ اس ملک میں جو معاملہ کیا جارہا ہے وہ دراصل اس کی قوم کو جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی صدیوں کی ایسی تاریخ کی حامل ہے جو اسلامی فکر اور گنگا جمنی تہذیب سے بنی ہے اور پورے برصغیر کے مسلمانوں نے اس سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور اس سے وابستگی اختیار کی ہے، اپنے اصل مزاج و خصوصیات سے ہٹ کر دوسرے مزاج و خصوصیات کی طرف ڈھکیلا جارہا ہے، اس طرح اس زبان کا خاتمہ یا تبدیلی پورے برصغیر کے مسلمانوں کے تشخص پر زبردست وار ہے، جس سے یہ مسلمان کس حد تک اپنے کو نقصان سے بچا سکیں گے یہ کہنا مشکل ہے۔

اردو زبان سے وابستگی اور حصول فیض سے مسلمانوں کو اگر محروم کر دیا گیا اور اس کے نتیجہ میں اردو کا ثقافتی اور مذہبی پہلو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کے نتیجہ میں بطور مثال عبادت کو پوجا، اور سلام کو پرنام، اور خدا کو ایشور، کہنے کی منزل آ گئی تو مسلمان عبادت کا تصور ہندو عبادت کے تصور میں اور مسلمان سلام کا تصور ہندو سلام کے تصور میں اور مسلمان کے خدا کا تصور ہندو کے خدا کے تصور میں تبدیل ہو جانا فطری بات ہوگی۔ اس طرح بظاہر تبدیلی صرف زبان کی ہوگی لیکن یہ تبدیلی عملاً عبادت کے لفظ کے دائرہ میں مذہبی پہلو کے لحاظ سے اور سلام کے لفظ کے دائرہ میں تہذیب کے پہلو کے لحاظ سے اور خدا کے لفظ کے دائرہ میں مذہبی عقیدہ کے لحاظ سے بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔

برصغیر میں جب انگریزوں کے اثر و غلبہ سے انگریزی کا ایسا رواج ہوا کہ کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کے یہاں ان کی اصل زبان کی اس نے جگہ لے لی، تو ان طبقوں کے ثقافتی و مذہبی تصورات و احساسات انگریز قوم کے تصور اور

احساسات سے زیادہ ہم آہنگ ہوگئے جس کی وجہ سے ایسے تعلیم یافتہ جو صرف انگریزی زبان وادب کے پروردہ تھے اپنے کو اپنی اصل قوم میں فٹ محسوس نہیں کر پاتے تھے، اور نہ ان کی قوم ان کو اپنے میں فٹ محسوس کرتی تھی۔ ایسے لوگ ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے ایک درمیانی منزل میں پڑ گئے تھے، انگریزوں کے غیر قوم ہونے کی وجہ سے وہ انگریز نہیں ہو سکتے تھے، اور اپنی قوم کی ثقافت سے غیر بن جانے کی وجہ سے وہ اپنی قوم کے مزاج کے نہیں رہ سکے، اس میں بنیادی اثر زبان کی تبدیلی کا ہوا۔

انگریز تو چلے گئے اور انگریزی کی وہ اہمیت اور مقام باقی نہیں رہا، جس سے اردو اور اس کی تہذیب میں وہ تبدیلی پیدا کر سکے، لیکن ہندوستان میں اردو کو متاثر کرنے والے اسباب موجود ہیں ان کا اثر پڑ سکتا ہے جو یہاں کے مسلمانوں کے لئے تہذیبی تبدیلی کا مرادف بن سکتا ہے اور یہ تہذیبی تبدیلی صرف تہذیبی تبدیلی نہ ہوگی بلکہ اس سے مذہب کی جس قدر وابستگی ہے، اسی قدر وہ تبدیلی مذہبی تصورات واحساسات پر بھی اثر انداز ہوگی۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ اگر مسلمان زبان کی ایسی تبدیلی پر مجبور ہو جائیں تو وہ اپنی اختیار کردہ زبان کو اپنی تہذیبی و مذہبی خصوصیات کا حامل بنائیں تاکہ ان کو اپنی خصوصیات سے دست کش ہونے پر مجبور نہ ہونا پڑے، زبان وادب سے تعلق ودلچسپی رکھنے والوں پر اس کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ اور یہ بہت اہم ذمہ داری ہے جس میں کوتاہی کو تاریخ معاف نہ کر سکے گی۔

حمد و دعاء و مناجات کی ادبیت

حمد و مناجات ایسے موضوعات ہیں جو دینی جذبات کے عکاس اور پروردگار عالم کے دربار میں پیش کرنے کے لئے اس کے بندوں کے اظہار عبدیت کا ذریعہ ہیں، ان کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ انسان کی، یہ جذبات مدح و اعتراف عظمت کی صورت میں ہوں تو حمد بن جاتے ہیں، اور ان میں محبت و وارفتگی کا ظہور ہو تو مناجات کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں، ان میں طلب و سوال کی بیچینی ہو تو دعاء بن جاتے ہیں، ان سب پہلوؤں میں جو بات قدر مشترک ہے، وہ ہے بندہ کا اپنے مالک و پروردگار سے ربط و تعلق، اس کے بندوں میں نبیوں، ولیوں کے یہاں، شاعروں اور ادب کے ماہروں کے یہاں، سب جگہ یہ صنف کلام ملتی ہے، اور وجدان و انفعال کے ادبی رنگ کی حامل ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کا موضوع مذہبی چھاپ رکھتا ہے، اس لئے عموماً اہل ادب اپنے سرمایہ فکر و فن میں اس کو شامل نہیں کرتے، اہل ادب کا یہ رویہ عموماً ہر اس کلام کے ساتھ ہوتا ہے جس کو ادب کی نیت و ارادہ سے اذانہ کیا گیا ہو، اس طرح ادب کے بہت سے لعل و گہر جو ادب کا لیبل نہیں رکھتے ہیں، ادبی دائرہ میں نمایاں کئے جانے سے رہ

جاتے ہیں، حالانکہ ادب وہ بھی ہے جو ادب کی نیت و ارادہ سے ادا کیا جائے، اور وہ بھی ہے جو اس نیت سے تو نہ ادا کیا جائے لیکن وہ زبان و بیان کے آداب پورے کرتا ہو اور اگر اس میں وجدان وانفعال بھی کارفرما ہو تو اس کو ادب کے شہ پاروں میں شمار نہ کرنا زیادتی ہے۔

حمد و مناجات و دعاء میں ادب کے رنگ کے خاصے نمونے ملتے ہیں، یہ ایک روح پرور کلام ہے، اور کم انسان ایسے ہوں گے جن کو ان میں سے کسی ایک سے واسطہ نہ پڑا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے شروع سے اپنے محبوب بندوں اور نبیوں کو حمد و مناجات و دعاء کی توفیق دی، انھوں نے خوب حمد و مناجاتیں کیں، قرآن مجید میں حمد و مناجاتوں اور دعاؤں کے مضمون کو بلیغ انداز اور مؤثر ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے، ان سے جذبات و کیفیات کی تصویر الفاظ کے پیرایوں میں ابھرتی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس طرح گویا اپنے بندوں کو تلقین بھی کی کہ اس سے کس طرح مخاطب ہوں، اس کی ایک مثال سورۃ البقرہ کی آیت آیت الکرسی میں اور سورہ حشر کے آخر کی آیات میں جامع اور مؤثر انداز کی حمد ہے، اور سورۃ فاتحہ میں تو اس سلسلہ میں جامعیت و جمال و کمال کی بڑی مثال ہے، اور عبدیت والتجا کے ساتھ مناجات و دعاء بھی ہے، قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بلیغ اور مؤثر کیفیت کے عکاس الفاظ میں حمد و دعاء و مناجات کے نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں، اور یہ سب نثر کا سرمایہ ہے، شعراء نے ان سے بھی کسب فیض کیا، انھوں نے اپنے دلوں کی التجاء و احساس کو شعری قالبوں میں ڈھالا، اور متنوع اسلوب اختیار کیا، اس طرح حمد و مناجات کے نمونے سامنے آئے،

اور ادب کی ایک ایسی صنف بن گئے جس میں دلنوازی بھی ہے اور احساس وشعور کے لئے اثر پذیری بھی ہے، وہ ایک طرف دل کو کھولتے ہیں اور دوسری طرف احساس وشعور میں تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

ادب کے مؤرخین اور ناقدین نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا، حالانکہ ادب کا یہ ایک شگفتہ اور وجدان وانفعال سے وابستہ کلام ہے، جو قابل قدر بھی ہے اور قابل استفادہ بھی۔

عربی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤثر نثری نمونے ہیں جو سچے انسانی تأثرات، پاکیزہ وبلند پایہ قلبی احساسات اور بلیغ ترین اسلوب وطرز ادا پر مشتمل ہیں اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سراپا تقویٰ تھی اور انسانی احساسات سے آراستہ تھی، آپ عربوں کے فصیح ترین قبیلے قریش میں تولد ہوئے اور فصیح ترین ہی قبیلے بنوسعد میں آپ کی نشو ونما ہوئی۔ پھر خوان قرآنی سے بہ طریق احسن کسب فیض فرمایا، بھلا اب آپ سے زیادہ پاکیزہ گفتار، شیریں کلام، راست گو اور بلیغ ومؤثر تعبیرات والا کون ہوسکتا تھا؟ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کی طرف سے آپ پر بے شمار درود وسلام ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ادب پارے سب کے سب نثری ہیں۔ کیوں کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ اس کی شہادت خود کتاب الٰہی دے رہی ہے: "وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ، إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْآنٌ مُّبِيْنٌ" (کہ ہم نے ان کو شعر کہنا نہیں سکھایا) اور یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مناسب نہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو ذکر الٰہی اور فصاحت وبیان کا حامل قرآن ہے۔

کلام نبوی بیک وقت سادہ بھی ہے اور پرکار بھی۔ اس میں بے تکلفی بھی ہے اور شیرینی بھی، چھوٹے چھوٹے جملوں میں گویا معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ محل اگر اختصار کا متقاضی ہے تو کلام موجز و مختصر ہے، اگر ضرورت دراز نفسی کی طالب ہے تو کلام طویل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تکلف و تصنع سے پاک اور رواں دواں ہوتی تھی۔ آپ نامانوس اور اجنبی کلام سے دور اور سوقیانہ، بازاری الفاظ سے محفوظ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ادب کی مختلف عمدہ اصناف پر مشتمل ہے، مثلاً تمثیلاتِ فائقہ، اقوالِ حکیمانہ و عالیہ، امثالِ نفیسہ، وصایائے مفیدہ، رشد و ہدایت، شریعت و تربیت اور مناجات و دعاء وغیرہ۔ پھر ان تمام اصناف میں سب سے زیادہ پر تاثیر، اپنے رب کے حضور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اور مناجاتیں ہیں۔ یہ دعائیں اس قدر طاقت ور، جامع اور پر اثر ہیں کہ ان سے عربی ادب میں نہ صرف یہ کہ ایک نئی صنف کا آغاز ہوا بلکہ اس نے ادب کی طاقتور ترین صنف کا درجہ حاصل کرلیا۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ دعائیں متین ہیں اور معنویت سے لبریز بھی، نیز دعا کرنے والے کے اندرونی احساسات، اس کے ابلتے ہوئے جذبات اور اپنے رب کے حضور اس کی لجاجت و انکسار کی عجیب و غریب بلیغانہ تصویر کشی کرتی ہیں۔

اس کی ایک مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں فرمائی تھی، جہاں آپ ایک اجنبی اور غریب الوطن کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی حامی و مددگار کی تلاش میں تشریف لے گئے تھے، یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کے چچا ابوطالب وفات پا چکے تھے، جو قوم کی ایذاؤں سے آپ کو بچاتے تھے، اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت

خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا چکی تھیں، جو آپ کی معاون وغم گسار تھیں، لیکن طائف جو مکہ جیسا ہی شہر تھا، وہاں کے باشندوں کے درمیان آپ کو اہل مکہ سے بھی زیادہ سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، یعنی وہاں کے رؤساء نے آپ کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا اور وہاں کے شرارت پسند آپ کے پیچھے لگ گئے، پھر انھوں نے آپ پر اس قدر پتھر برسائے کہ آپ کے دونوں پائے مبارک لہولہان ہو گئے، اس وقت آپ کا دل شدت الم سے چور چور تھا اور تعب جسمانی بھی بے پناہ تھا۔ ظالموں نے مکہ سے طائف تک کے طویل سفر کے بعد آپ کو دم لینے کی مہلت بھی نہ دی تھی، اس لئے آپ طائف کی آبادی سے باہر نکل کر ایک کھلی ہوئی جگہ میں بیٹھ گئے، جہاں شاید بجز آپ کے خادم وغلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نہ کوئی مونس تھا نہ غم گسار۔ آپ نے اس حال میں یہ دعاء فرمائی جو آپ کی زخموں سے چور لیکن حلیم شخصیت کی راست ادبی تصویر ہے:

اللهم اليك أشكو ضعف قوتي ، وقلة حيلتي ، وهواني على الناس، رب المستضعفين الى من تكلني ؟ الى بعيدٍ يتجهمني ، أم الى عدو ملكته أمري؟ ان لم يكن بك عليّ غضب فلا أبالي ، غير أن عافيتك هي أوسع لي ، أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات و صلح عليه أمر الدنيا و الآخره، من أن يحل بي غضبك ، أو ينزل عليّ سخطك ، لك العتبىٰ حتى ترضى ولا حول ولا قوة الا بك۔

"اے اللہ! میں اپنی بے طاقتی وناتوانی، اپنی تدبیروں کی بے سروسامانی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے وقعتی کی آپ ہی سے عرض معروض کرتا ہوں، اے کمزور سمجھ لئے جانے والوں کے پالنہار! آپ مجھے کس کے حوالے کررہے ہیں؟ کیا اس دور دراز شخص کے جو مجھ سے برہمی کے ساتھ پیش آتا ہے؟ یا آپ نے میری زمام کار کسی دشمن کو سونپ دی ہے؟ لیکن اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے ان سب کی پرواہ نہیں ہے، مگر پھر بھی آپ کے سایہ عافیت میں میرے لئے زیادہ گنجائش ہے۔ میں آپ کی ذات کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں، جس سے ظلمتیں روشن ہیں اور جس کے سہارے دنیا وآخرت کے تمام امور اپنے صحیح رخ پر چل رہے ہیں، اس بات سے پناہ کہ مجھ پر آپ کا غصہ اترے اور آپ ناراضگی نازل فرمائیں۔ آپ ہی کا حق ہے کہ آپ کو منایا جائے تا آنکہ آپ راضی ہوجائیں۔ آپ کی مدد کے بغیر نہ کسی طاقت کا وجود ہے نہ قوت کا۔"

اس دعاء کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگارِ غالب وقادر ومہربان کے سامنے اپنی اس ناتوانی کو بیان فرمارہے ہیں جو اس وقت عملاً سامنے آئی اور وہ یہ کہ رؤسائے ثقیف کے ہاتھوں قریش کے سامنے آپؐ کی ایسی بے وقعتی ہوئی جو آپؐ جیسے قریشی کے لئے بالکل نئی چیز تھی، کیونکہ قبیلہ ثقیف کے قریش کے ساتھ قریبی روابط تھے، پھر اپنے پروردگار سے مہربانیوں کی طلب کرتے ہوئے اور اس کی جناب میں الحاح وزاری کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: "رب المستضعفین" (اے کمزور سمجھ لئے

جانے والوں کے پالنہار) پھر اللہ سے رحمت کی خواستگاری کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں: الی من تکلنی ؟الی بعیدٍ یتجھمنی ، أم انی عدو ملکتہ أمری ؟ (آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ کیا اس دور دراز شخص کے جو مجھ سے برہمی کے ساتھ پیش آئے؟ یا آپ نے میری زمام کار کسی دشمن کو سونپ دی ہے؟) پھر آپ کو تنبہ ہوتا ہے اور آپ تاسف و اضطراب کی کیفیت پر قابو پا لیتے ہیں۔ یہ حقیقت پیش نظر آجاتی ہے کہ آپ کا رب ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ آپ کا کوئی معاملہ اس سے ڈھکا چھپا نہیں ہے اور نہ ہی وہ آپ سے غافل ہے، اسی نے تو آپ کو منتخب فرمایا اور منصب رسالت پر فائز کیا ہے، نیز تبلیغ رسالت کی ذمہ داریاں عائد کی ہیں، تو کیا وہ آپ کو یوں ہی بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ لیکن آخر یہ سب کچھ ہوا کیوں کر؟ کیا آپ کا پروردگار آپ سے ناراض ہے؟ اس لئے عرض کرتے ہیں:

"ان لم یکن بك علیّ غضب فلا أبالی ، غیر أن عافیتك ھی أوسع لی"

"اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو یہ جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی آپ کا سایۂ عافیت میرے لئے زیادہ گنجائش رکھتا ہے۔"

پھر آپ اللہ تعالیٰ سے پناہ کی درخواست، اس کی عظمت و رحمت کا تذکرہ اور ہمیشہ کی رضا کا سوال کرتے ہیں، کیونکہ اس کی مدد کے بغیر نہ کسی طاقت کا وجود ہے نہ قوت کا۔

دعاء و مناجات کلام انسانی کی وہ جولان گاہ ہے، جہاں صاحب

دعا کے باطنی احساسات صاف نظر آتے ہیں، جہاں اس کے بے چین وغم زدہ دل کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور جہاں جذبات مجسم ہوجاتے اور الفاظ کا ایسا جامہ پہن لیتے ہیں کہ ان میں اثر انگیزی کی صفت پیدا ہوجاتی ہے، اور سننے والے کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ پھر اگر صاحب دعاء کا یہ رتبہ ہو کہ زبان وبیان پر اس کی گرفت حاکمانہ ہو اور اس کا کلام بلاغت نظام، سحر حلال کا درجہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں قاری وسامع، صاحب دعاء کے الفاظ میں اس کی روح کو چھو کر محسوس کرسکتا ہے اور اسے متحرک و بے قرار دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی یہی شان ہے۔ ان میں آپ کی معجزانہ بلاغت پوری طرح جلوہ گر ہے اور یہ ایسی خصوصیات وامتیازات سے مزین ہے، جن کا سرچشمہ قرآن پاک کی مؤثر تعلیمات ہیں۔ کیونکہ اگلے انبیاء ورسل کی دعاؤں اور مناجاتوں کے مؤثر قرآنی نمونے آپ پر نازل ہوئے اور آپ نے انھیں کی آغوش میں تربیت پائی۔ پھر آپ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف احوال کے دوران یہ دعائیں منصۂ شہود پر آئیں۔ یہ دیکھنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے باطنی احساسات کی تصویر کشی اور فن کارانہ ترجمانی کس طرح فرمائی ہے؟ اس کی ایک مثال تو وہ دعاء تھی، جس کا ذکر طائف کے سلسلے میں گذر چکا، دوسری مثال دعائے بدر ہے۔ اس دن بھی آپ پر بے چینی اور اضطراب کی اثر انگیز کیفیت طاری تھی۔ اس دن مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں پہلی بار دشمنان کفار کے مقابل صف آرا ہوئے تھے۔ یہ اسلام کے حق میں ایک فیصلہ کن دن تھا، وہ اسلام جس کی تبلیغ اور استحکام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام صلاحیتیں لگادی

تھیں۔ اس کے بچاؤ کی تدبیریں کی تھیں اور اس کی راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیکوکار صحابہ نے ہر طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں۔ یقیناً یہ ایک عظیم الشان اور فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن کفار مکہ نکل کھڑے ہوئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ اپنی تمام تر طاقت وقوت اور شان وشوکت کا مظاہرہ کریں اور اسلام کے خلاف جو کچھ کر سکتے ہیں، کر گذریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف کے مقابل اپنے لشکر کو صف آرا کیا اور مقدور بھر تیاری اور ساز وسامان کی فراہمی کی، پھر تنہائی میں ایک چھپر تلے اپنے رب کے حضور مصروف دعاء ومناجات ہو گئے۔ وہاں بجز حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے اور کوئی نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت تھی کہ آپ اپنے رب سے اس مدد کی طلب فرما رہے تھے جس کا اللہ کی طرف سے وعدہ تھا۔ دعاء کے درمیان زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے" اللھم ان تھلك ھذہ العصابة الیوم فلن تعبد " (اے اللہ! اگر آج کے دن یہ مٹھی بھر جماعت مٹ گئی تو پھر آپ کی عبادت نہ کی جا سکے گی) پھر آپ کی مناجات اور الحاح وزاری اس قدر بڑھ گئی کہ آپ کے رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے چین ہو کر کہہ اٹھے۔ اے اللہ کے نبی! اب بس کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے کئے ہوئے وعدے کو ضرور پورا فرمائے گا۔

دعاء بدر کے سلسلے میں راویوں سے یہی چھوٹا سا جملہ منقول ہے، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الحاح واضطراب کی ایک علامت اور سلگتے ہوئے احساسات کی ترجمانی کہہ سکتے ہیں۔ اگر دعاء کی پوری عبارت منقول ہوتی، جس کا یہ جملہ ایک جزو ہے، تو وہ شدت تأثیر اور خوبیٔ ادا کی

ایک مثال ہوتی ۔ اس کا کسی قدر اندازہ ہم آپ کی ایک دوسری دعاء، دعائے عرفات سے لگا سکتے ہیں ۔ یہ دعاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احساساتِ قلب بریاں کی تصویر اور رب العالمین کے حضور حسیت عبودیتِ خالصہ کی تعبیر ہے۔ اس دعاء کے الفاظ میں ایک خاص طرح کی متانت وجزالت اور اسلوب میں نرمی ولطافت پائی جاتی ہے۔ عرض کرتے ہیں: ''اللھم انك تسمع كلامي، وترى مكاني، وتعلم سري وعلانيتي، لايخفى عليك شيئ من أمري.'' (اے اللہ! آپ میری باتوں کو سن رہے ہیں، میری صورت حال کو دیکھ رہے ہیں ۔ میرا باطن وظاہر آپ کے علم میں ہے، میرا کوئی معاملہ آپ سے مخفی نہیں ۔)

اس کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور اپنی کھلی ہوئی ناتوانی کا اعتراف فرمارہے ہیں، کیونکہ وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ آپ کی باتیں سن رہا ہے اور آپ کا کوئی معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ اپنے رب کے حضور، بندے کی حالت وکیفیت دوسرے تمام احوال وکیفیات سے غایت درجہ مختلف ہوتی ہے، اسے نہ کسی بادشاہ اور اس کی رعایا کی وضع وکیفیت کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اور نہ ہی کسی آقا اور اس کے کسی غلام کی صورت حال کے مماثل قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ رب العالمین کی بارگاہ میں اس کا ایک بندہ حاضر ہے، جسے اپنے رب کی کامل وہمہ جہت ربوبیت پر پورا ایمان اور اس کے وسیع و دقیق علم اور قدرت کاملہ پر کلی اعتبار ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعاء میں رب عظیم کے سامنے اپنی حالت زار کی تصویر پیش کی ہے۔ چنانچہ عرض کرتے ہیں:۔

أنا البائس الفقير ، المستغيث المستجير۔

''میں ہوں بے چارہ مصیبت زدہ محتاج، فریادی، پناہ جو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کے ذریعے، اس اشارۂ ربانی کی موافقت فرمائی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب الٰہی کی ایک سورہ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى. مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى.

آگے فرماتے ہیں: ''اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى . وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى. وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى .'' ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وقت چاشت اور وقت صبح کو اس بات کا گواہ بنایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا معاملہ توجہ خصوصی اور رحمت خاص کا ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حالتِ احتیاج و ناتوانی میں وسائل زندگی فراہم کئے، اس لئے کہ آپؐ بہ وقت ولادت باپ کی طرف سے یتیم تھے اور نشو ونما کا زمانہ آیا تو ماں کی طرف سے بھی یتیم ہو گئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو تلف ہونے سے بچایا۔ پھر جب آپ کا کوئی رہنما نہ تھا تو منصب نبوت سے سرفراز کر کے ہدایت کے راستوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اسی طرح آپ حالت احتیاج میں تھے کیونکہ وراثت میں آپ کو نہ کوئی مال ہاتھ آیا تھا نہ دولت۔ پھر آپ کا کوئی کفیل بھی نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی والد وفات پا چکے تھے اور ابھی عہد طفولیت ہی تھا کہ والدہ بھی چل بسیں، پھر کم سنی ہی میں دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح جب آپؐ نے رواں دواں زندگی کے حدود میں قدم رکھا

تو آپؐ پوری احتیاج و بے سروسامانی میں تھے، لیکن رب رووٗف نے آپ کی دست گیری فرمائی اور آپؐ کے لئے اسباب غنیٰ فراہم کردیئے۔ تلاوتِ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا ہی اس لئے آپ نے اپنی دعاؤں میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھا ہے، عرض کرتے ہیں: ''أنا البائس الفقير ، المستغيث المستجير '' پھر جب آپ کی نگاہ تبلیغ رسالت کی اس عظیم ذمہ داری کی جانب ملتفت ہوئی، جو آپ کے دوش مبارک پر ڈال دی گئی تھی، اور جس کے بوجھ تلے پشتِ مبارک گویا ٹوٹی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جب آپ نے راہ تبلیغ میں اپنی کوششوں کا جائزہ لیا اور انھیں درجۂ مطلوب سے کمتر تصور فرمایا، تو آپؐ خجیت طاری ہوگئی، آپ سہم گئے اور اعترافِ خطا کا اعلان فرماتے ہوئے مصروف دعاء ہوگئے: '' المقر المعترف بذنبه ''(میں ہی ہوں اپنی خطاؤں کا معترف اور مقر) پھر آپ نے احساس ناتوانی واحتیاج اور اعتراف قصور و خطا کی اس فضا میں کامل درجہ الحاح وزاری کے ساتھ عرض کیا:

" أسألك مسئلة المسكين وأبتهل اليك ابتهال المذنب الذليل و أدعوك دعاء الخائف الضرير دعاء من خضعت لك رقبته ، و ذل لك جسمه ، ورغم لك أنفه"

''میں ایک بڑے بے کس کی طرح آپ سے سوال کرتا ہوں اور اس شخص کی طرح گڑگڑاتا اور آہ وزاری کرتا ہوں جو خطا کار بھی ہو اور رسوا و بے عزت بھی، اور خوف زدہ آفت رسیدہ شخص کی طرح آپ کو پکارتا ہوں، جس کی گردن آپ کے آگے جھکی ہوئی

ہو اور جس کا بدن احساس ذلت سے دبا جا رہا ہو اور جو کہ احساس ندامت سے ناک رگڑ رہا ہو۔"

اس حالت سے بڑھ کر فروتنی اور لجاجت کی اور کون سی حالت ہوگی، جو ایک بے کس، خوف زدہ اور آفت رسیدہ کی حالت ہے، جس میں ناتوانی، بے کسی اور تحیر کی تمام کیفیات جمع ہوگئی ہیں اور جس کی ترجمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رب قادر و جلیل کی ربوبیت کے سامنے عبدیت کاملہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمائی ہے۔ آپؐ اپنی دعاء میں آگے فرماتے ہیں:۔

اللھم لا تجعلنی بدعائك شقیا، و کن بی رؤ فا رحیما، یا خیر المسئولین و یاخیر المعطین۔

"اے اللہ! میں نے یہ دعاء جو آپ سے کی ہے، اس میں مجھے ناکام نہ بنایئے، مجھ پر مہربان و رحیم ہو جایئے، اے ان سب سے بہترین جن سے مانگا جائے اور اے ان سب سے بہتر جو دے سکتے ہوں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کے ذریعہ اپنے رب کو پکارا ہے۔ اس سے سرفرازی رحمت اور مہربانی کی درخواست کی ہے اور ناکامی و اتلاف سے حفاظت چاہی ہے۔

اب آپ کے سامنے یہ دعاء مکمل اور مسلسل صورت میں پیش کی جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی عبارت میں ایک خاص طرح کی ہم آہنگی اور مسحور کن حسن ہے۔ اسی طرح ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی جانب منتقل ہونے کا عمل بھی فطری محسوس ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

عرض کرتے ہیں:

اللھم انك تسمع کلامی ، وتری مکانی ، وتعلم سری و علانیتی،لایخفی علیك شیئ من أمری،وأناالبائس الفقیر، المستغیث المستجیر، الوجل المشفق ، المقر المعترف بذنبه ، أسألك مسئلةالمسکین وأ بتهل الیك ابتهال المذنب الذلیل و أدعوك دعاء الخائف الضریر، دعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته ، وذل لك جسمه ،ورغم لك أنفه ،اللھم لا تجعلنی بدعائك شقیاء وکن بی روء فا رحیما ، یا خیر المسئولین و یاخیر المعطین ۔

"اے اللہ! آپ میری باتوں کو سن رہے ہیں، اور میری صورت حال دیکھ رہے ہیں میرے باطن وظاہر سے واقف ہیں، میری کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں ہے، میں ہوں مصیبت زدہ، محتاج، فریادی، پناہ جو، ترساں، ہراساں، اپنی خطاؤں کا مقر اور معترف، میں آپ سے بے کس کی طرح سوال کرتا ہوں، ذلیل گناہ گار کی طرح آپ کے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح آپ کو پکارتا ہوں، اس شخص کی پکار کی طرح جس کی گردن آپ کے آگے جھکی ہوئی ہو، اس کے آنسو آپ کے لئے بہہ رہے ہوں، وہ فروتنی کئے ہوئے ہو اور آپ کے آگے اپنی

ناک رگڑ رہا ہو، اے اللہ مجھے اس دعاء میں ناکام نہ بنایئے، مجھ
پر مہربان و رحیم ہو جائے، اے مانگے جانے والوں میں سب
سے بہتر اور اے دینے والوں میں سب سے بہتر۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کو "مغز عبادت" بتلایا ہے۔ فی الواقع یہ دعاء کی بہت عمدہ تعریف ہے، اس لئے کہ دعاء ایک ایسا عمل ہے جس کے تمام گوشے اور زاوئے روح عبودیت سے معمور ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعاء صاحب دعاء کے ذہن و دماغ کو اپنے خالق و پروردگار سے حد درجہ قریب کر دیتی ہے، چنانچہ دعاء خواں جب اخلاص و طمانیت کے ساتھ اپنے رب سے محو مناجات ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ اپنے پروردگار کے سامنے جھکا ہوا ہے اور بار بار اسے دیکھے جا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کی تعبیر کلمہ "احسان" سے فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: "احسان" یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو یہ حقیقت ہی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی یہی کیفیت تھی۔ رہ گئیں آپ کی دعائیں اور مناجاتیں تو وہاں یہ کیفیت قوی ترین شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مصروف دعاء ہوتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا اس جانی پہچانی دنیا سے نکل کر کسی اور دنیا میں تشریف فرما ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو اسلوب و ادا کے لحاظ سے ان قرآنی دعاؤں سے بہت قریب ہیں، جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا تو آپ کی تعلیم کے لیے فرمایا، یا انبیاء سابقین کی دعاؤں

کے سیاق میں کیا ہے، آپ کی ان دعاؤں کا جائزہ لیا جائے تو قلبِ انسانی ان کی قدر و قیمت کے احساس سے معمور اور ان کے زیر اثر پیدا شدہ فضا کی بلند پائیگی سے مسحور ہو جاتا ہے، گویا ایک آواز ہے جو کسی اور دنیا سے آ رہی ہے، جہاں تک ان دعاؤں کے اسلوب اور طرز ادا کا تعلق ہے تو وہ بہت ہی خوبصورت اور لطیف ہے، پرکار اور سادہ ہے، کبھی چشمہ صافی کی طرح سبک خرام اور کبھی چٹانوں کے درمیان سے گزرنے والے پرشور دریا کی مانند تیز گام۔ اب ہم آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے چند مسلسل اور مربوط نمونے پیش کرتے ہیں، جو آپ نے مختلف اوقات میں اپنے رب کے حضور کی ہیں۔ یہ شرح و ترجمانی سے بے نیاز ہیں :

اللهم فارج الهم، كاشف الغم، مجيب دعوة المضطرين رحمٰن الدنيا ورحيمها، أنت ترحمني، فارحمني برحمة تغنيني بها عن رحمة من سواك۔

"اے ہموم و افکار کے دور کرنے والے! غم و الم کے زائل کرنے والے! مجبوروں و بے بسوں کی پکار سننے والے! اہل دنیا کے رحمٰن و رحیم! آپ مجھ پر رحم کریں گے تو آپ ایسی رحمت نازل فرمایئے، جو مجھے دوسروں کے رحم و ہمدردی سے بے نیاز کر دے"

اللهم لك الحمد، واليك المشتكى، وبك المستغاث، وأنت المستعان، ولا حول ولا قوة الا بك۔

''اے اللہ! حمد کا استحقاق آپ ہی کو ہے، تکلیف ومصیبت کا عرض معروض آپ ہی سے کیا جاتا ہے، فریادرس آپ ہی کی ذات ہے۔ مدد آپ ہی سے طلب کی جاسکتی ہے۔ طاقت وقوت آپ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں۔''

اللهم انی أعوذ برضاك من سخطك، وبمعافاتك من عقوبتك، وأعوذ بك منك، لا أحصی ثناء عليك، أنت كما أثنيت على نفسك اللهم انا نعوذ بك من أن نزل أو نزل، او نضل، أو نظلم أو يظلم علينا، أو نجهل أو يجهل علينا، أعوذ بنور وجهك الكريم الذی أضاءت له السموٰات، واشرقت له الظلمات، وصلح عليه أمر الدنيا و الآخرة أن تحل علی غضبك، و تنزل علی سخطك، ولك العتبی حتی ترضیٰ، ولا حول ولا قوة الا بك، اللهم واقية كواقية الوليد، اللهم انی أعوذ بك من شر الأعميين السيل و البعير الصئول۔

''اے اللہ! میں پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کی، آپ کی ناخوشی سے۔ آپ کے عفو کی، آپ کی عقوبت سے اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں خود آپ سے، میں آپ کی تعریف کا حق نہیں ادا کرسکتا۔ آپ اسی تعریف کے مستحق ہیں، جو آپ نے اپنی ذات کی خود

فرمائی ہے۔ اے اللہ! ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں بچل جانے سے، یا کسی کو بچلانے سے، یا کسی کو گمراہ کرنے سے یا کسی پر ظلم کرنے سے، یا خود نشانہ ظلم بننے سے، یا جہالت کرنے سے، یا کسی کی جہالت کا شکار بننے سے، یا گمراہ ہونے سے، یا گمراہ کئے جانے سے، میں پناہ چاہتا ہوں آپ کی ذات گرامی کے نور کی، جس سے آسمان روشن ہیں، ظلمتیں تاباں ہیں اور جس کے سہارے دنیا و آخرت کے تمام امور اپنے صحیح رخ پر چل رہے ہیں، اس بات کی پناہ کہ مجھ پر آپ کا غصہ ہو، یا آپ اپنی ناخوشی مجھ پر ظاہر کردیں، آپ ہی کا حق ہے کہ آپ کو منایا جائے، تا آنکہ آپ راضی ہو جائیں، آپ کی مدد کے بغیر نہ طاقت ہے، نہ قوت۔ اے اللہ! جس طرح کسی بچے کی نگہبانی کی جاتی ہے، بس ایسی ہی آپ سے نگہبانی چاہتا ہوں۔ اے اللہ! مجھے دو اندھا دھند باتوں یعنی سیلاب اور حملہ آور اونٹ کے شر سے اپنی پناہ میں لے لیجئے۔"

رب أعنی ولا تعن علی، وانصرنی ولا تنصر علی، وامکرلی ولا تمکر علی، واهدنی ویسر الهدیٰ لی، وانصرنی علی من بغی علی، رب اجعلنی لك ذکّارا، لك شکّارا، لك رهّابا، لك مطواعا، لك مطیعا، الیك أوّاهامنیباً، رب تقبل توبتی، واغسل حوبتی، وأجب دعوتی، وثبت حجتی، و سدد لسانی،

واهد قلبي ، واسلل سخيمة صدري۔

''اے پروردگار! میری مدد کیجئے اور میرے برخلاف مدد نہ کیجئے، مجھے کامیابی دیجئے اور میرے برخلاف کامیابی نہ دیجئے، میرے لئے تدبیر فرمایئے اور میرے برخلاف تدبیر کو کامیاب نہ بنائے، مجھے ہدایت دیجئے اور میرے لئے راہ ہدایت کو آسان کردیجئے جو مجھ پر زیادتی کرے اس کے خلاف میری مدد فرمائے۔ اے اللہ! مجھے ایسا بنادیجئے کہ میں آپ کو بہت یاد کیا کروں، آپ کا بڑا شکر گذار بنوں، آپ سے بہت زیادہ ڈرتا رہوں، آپ کا بہت زیادہ فرمانبردار بنوں، آپ کا بہت زیادہ اطاعت گذار بنوں، آپ ہی سے سکون پانے والا بنوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ ہونے والا اور رجوع کرنے والا رہوں، اے پروردگار! میری توبہ قبول فرمائے، میرے گناہ دھودیجئے، میری پکار سن لیجئے میری حجت قائم رکھیئے میری زبان درست رکھئے، میرے دل کو ہدایت دیجئے، اور میرے سینے کی کدورت نکال دیجئے۔''

اللهم ألف بين قلوبنا، وأصلح ذات بيننا، واهدنا سبل السلام، ونجنا من الظلمات الي النور، وجنبنا الفواحش ماظهر منها ومابطن، بارك لنا في أسماعنا وأبصارنا وقلوبنا وأزواجنا وذرياتنا، تب علينا، انكأنت التواب الرحيم، واجعلنا شاكرين لنعمتك، مثنين بها، قابليها، وأتمها علينا۔

''اے اللہ! ہمارے دلوں میں باہم الفت پیدا کردیجئے۔ ہمارے باہمی تعلقات درست فرمادیجئے، ہمیں سلامتی کی راہیں دکھلایئے، ہمیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف پہنچادیجئے، ہمیں ظاہری و باطنی بے حیائیوں سے دور رکھئے، برکت عطا فرمایئے ہماری شنوائیوں میں ہماری بینائیوں میں، ہمارے قلوب میں، ہماری ازواج میں اور ہماری اولاد میں، ہماری توبہ قبول فرمایئے کہ آپ ہی ہیں بار بار توبہ قبول فرمانے والے اور نہایت مہربان، ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گذار، ثناخواں اور ان کا اہل بنائے اور ہم پر اپنی نعمتیں پوری پوری اتار دیجئے''

اللهم اقسم لنا من خشيتك ماتحول به بيننا وبين معاصيك ، ومن طاعتك ماتبلغنا به جنتك ، ومن اليقين ماتهون به علينا مصائب الدنيا ، ومتعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ماأحييتنا، واجعله الوارث منا ،واجعل ثأرنا على من ظلمنا وانصرنا على من عادانا، ولاتجعل مصيبتنافي ديننا، ولاتجعل الدنيا أكبر همنا، ولا مبلغ علمنا، ولا غاية رغبتنا ، ولا تسلط علينامن لا يرحمنا۔

''اے اللہ! ہمیں اپنی خشیت سے اتنا بہرہ مند فرمایئے کہ وہ ہمارے اور آپ کی نافرمانیوں کے درمیان حائل ہوجائے، اور اپنی اطاعت سے اس قدر حصہ دیجئے کہ اس کے ذریعہ ہمیں اپنی

جنت تک پہنچادیں، اور ایمان ویقین سے اس حد تک بہرہ ور فرمائے کہ اس کے ذریعے آپ دنیا کی مصیبتیں ہم پر سہل فرمادیں، جب تک ہمیں زندہ رکھئے اور اسے ہمارا وارث بنائے، جو ہم پر ظلم کرے اس سے ہمارا انتقام لیجئے، جو ہم سے دشمنی کرے اس کے مقابل ہماری مدد فرمائیے، ہماری مصیبتیں ہمارے دین سے متعلق نہ فرمائیے، دنیا کو ہمارا محور، ہمارے علم کی معراج اور ہماری غایت محبت کا درجہ نہ دیجئے، بے رحموں کو ہم پر مسلط نہ فرمائیے۔"

اللهم زدنا ولا تنقصنا، وأكرمنا ولا تهنا، وأعطنا ولا تحرمنا وآثرنا ولا تؤثر علينا، وأرضنا وارض عنا۔

"اے اللہ! ہمیں بڑھائیے، ہمارے اندر کمی نہ فرمائیے، ہمیں باآبرو رکھئے رسوا نہ کیجئے، ہمیں نوازیئے محروم نہ رکھیے، ہمیں مقدم رکھئے، ہمارے برخلاف ترجیح نہ دیجئے، ہمیں خوش کردیجئے، اور ہم سے خوش ہوجائیے۔"

اللهم لا تدع لنا ذنبا الا غفرته، ولا هما الا فرجته ولا دينا الا قضيته، ولا حاجة من حوائج الدنيا والآخرة الا قضيتها يا أرحم الراحمين۔

"اے اللہ! ہمارا کوئی گناہ باقی نہ رہنے دیجئے، معاف فرمائیے، کچھ ہموم وافکار باقی نہ رہنے دیجئے دور کردیجئے، کوئی قرض باقی نہ رکھئے چکا دیجئے اور دنیا وآخرت کی تمام ضروریات پوری

فرما دیجئے۔ اے ارحم الراحمین۔"

میں دعاہائے نبوی کے انھیں شہ پاروں پر اکتفا کرتا ہوں، جو ہیں تو بہت زیادہ لیکن یہاں تھوڑی مقدار میں پیش کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ہمیں اپنی فرمانبرداری اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کی توفیق نصیب فرمائے اور اسوۂ نبوی کو اپنانے کی صحیح ایمان اور جذبہ سے دعاء کرنے کی کوششوں میں کامیاب کرے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيرا۔"

گناہوں سے برگشتگی اور طاعات کی قوت اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر متصور نہیں۔

سفر کا تذکرہ قرآن مجید کی زبان میں

سفر کو قدیم عہد ہی سے انسانی ضرورت سمجھا گیا ہے، اور اس کے ذریعہ انسان نے بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے، تمام قوموں میں اس کے واقعات ملتے ہیں، ان میں عرب بھی ہیں، غیر عرب بھی عہد قدیم کے سیاح بھی ہیں اور جدید عہد کے مسافر بھی ہیں، عربوں کی زندگی میں تو اس کا خاص اہتمام ملتا ہے ان کے جزیرہ کی زندگی ایسی تھی کہ اکثر عربوں کو سفروں سے بہت واسطہ پڑتا تھا، ان سفروں کا ذکر ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے، سفر کے بعض تذکروں میں سفر کے دوران کے اہم تأثرات اور مؤثر احوال و مشاہدات ملتے ہیں۔

عربوں کے یہ سفر طویل اور منظم طریقہ سے ہوتے تھے، تاریخ کی کتابوں میں ان کی جگہ جگہ تفصیلات بھی ملتی ہیں، پھر قرآن مجید میں سفر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس سے حالات کا علم ہوتا ہے، تجربے ہوتے ہیں، اور صحیح بات کو سمجھنے میں اور صحیح علم حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ایسی آیتیں ملتی ہیں جن میں سفر کرنے اور چل پھر کر حالات کو دیکھنے اور گذشتہ قوموں کے حالات جان کر عبرت حاصل کرنے کی

طرف توجہ دلائی گئی ہے، پھر حضرت موسیٰؑ کے سفر کا واقعہ سورۂ کہف میں اور ذوالقرنین کے سفر کا واقعہ اسی سورہ میں خاص انداز سے اور قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اسلام آنے کے بعد تو سفروں کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے ،شاعری میں بھی اس کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے اور سفر کرنے والے کو حوصلہ منداور بلند صفات بلکہ حیثیت کا آدمی قرار دیا گیا ہے، حتی کہ سفر کی نسبت سے اس کی عظمت کو ثابت کیا گیا ہے، جریر شاعر کہتا ہے:

ألستم خير من ركب المطايا

آپ تو سفر کرنے والوں کے بلند طبقے میں ہیں

ابوتمام نے اپنی بیوی کو اپنے سفر پر رخصت کرتے ہوئے رنجیدہ ہونے پر سمجھایا ہے، اور مؤثر انداز میں کہا کہ سفر تو ضروری کام ہے، اس کے بغیر عزت کم حاصل ہوتی ہے، اور سفر سے واپسی پر جو خوشی ہوتی ہے وہ خود ایک بڑی چیز ہے یہ خوشی بغیر سفر کی مشقت اور دوستوں کی جدائی برداشت کئے کیسے حاصل ہوسکتی ہے، سفروں کے جستہ جستہ تذکروں کے علاوہ عربوں نے سفروں پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔

سفرنامے لکھنے کا آغاز جن مصلحتوں سے اور جن مقاصد سے بھی ہوا ہو، یہ موضوع جلد ہی ایک دلنواز موضوع بن گیا، اور اس کو پڑھنے والے اس کو عام طور پر اسی شوق سے پڑھنے لگے جس شوق سے ادب کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، اور وہ اس میں لگ بھگ وہی لطف محسوس کرنے لگے جو ایک ادبی کتاب میں ملتا ہے۔

کسی بھی تصنیف و تحریر کی صحیح جگہ علم وادب کے دائرے میں متعین کرنے کے سلسلہ میں لکھنے والے کا مقصد اور اس مقصد کے لئے زبان

وبیان کا مناسب انتخاب اور قاری کے فائدہ اٹھانے یا لطف لینے کی کیفیت کے لحاظ سے بہت دخل ہے، اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم مختلف سفرناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہم کو کئی طرح کے ملتے ہیں بعض سفرنامے جغرافیہ کے دائرے میں محدود ہیں یا ہو کر رہ گئے ہیں۔ بعض علمی وفکری یا سیاسی یا محض سماجی مقصد کو پورا کرنے والے ثابت ہوئے ہیں اور ان میں ایک تعداد ادب کا بھی لطف لینے والی ثابت ہوئی ہے اس سلسلہ میں شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ سفرناموں کے لکھنے والوں کو عموماً ان کے قلم کی جولانی اور طبع آزمائی نے ہی سفرنامے لکھنے پر آمادہ کیا اور اسی نے سفرنامے میں ادب کا رنگ پیدا کر دیا۔

سفرنامے مختلف مقاصد کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا سفرناموں میں بھی اس کا تنوع ملتا ہے اس تنوع کی ایک بڑی قسم حج کے سفرنامے ہیں ان کے علاحدہ امتیاز رکھنے کی مثال اس طرح بھی دی جاسکتی ہے کہ شاعری کے باب میں مدح کے اندر جس طرح نعت نے اپنی علاحدہ شان بنالی اور طاقت اور وسعت کے لحاظ سے وہ شاعری کی ایک دلنواز اور کیفیت سے بھرپور صنف بن گئی اسی طرح سفرناموں میں حج کے سفرناموں کو ایک علاحدہ اور دلنواز کیفیت سے بھرپور ادب کی حیثیت حاصل ہوئی اور اس نے سفرناموں کے ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اور اثر سے بھرپور ادب کی جگہ بنائی ہے اس طرح نثری ادب میں یہ ایک وقیع ذخیرہ ہے۔

سفرناموں کے لکھنے کا رواج پرانا ہے، لیکن جدید عہد سے قبل وسائل علم واشاعت کی کمی کے باعث ان کی تعداد بھی کم ہوتی تھی، یا کم ملتی ہے۔ پھر بھی جو کئی معرکۃ الآراء سفرنامے لکھے گئے ان کو غیر معمولی شہرت ملی،

اوران سے ان کے عہد کے لوگوں کے ذوق ومزاج اور اس عہد کے سماج کے خط وخال سمجھنے میں مدد ملی، عربی میں ابن بطوطہ، محمد بن جبیر اور البیرونی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ یورپین زبانوں میں بھی کئی ایسے سفرنامے لکھے گئے جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، یہ سفرنامے عام طور پر بڑے اولوالعزم اور خطرات میں کود پڑنے والوں کے لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے صعوبتوں کے باوجود طویل سفر کیے۔

عہد جدید میں سفر کی سہولتیں بڑھیں دوسری طرف وسائل علم و اشاعت بھی بڑھے اس کے نتیجہ میں سفرناموں کے لکھنے کی تعداد بڑھی، اور اہل فکر وادب نے بھی اس راہ سے اپنے ذوق علمی وادبی کو پورا کیا، چنانچہ موجودہ عہد کے سفرناموں کو اگر ہم شمار کرنے کی طرف توجہ دیں تو وسیع ذخیرہ بن جائے گا۔ یہ سب اپنی کثرت اور وسعت کے باوجود لطف وافادیت سے خالی نہیں ہیں، اوران میں متعدد بہت غیر معمولی خصوصیت کے حامل سفرنامے بھی شامل ہیں۔ جن سے استفادہ کرنے والے کو بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔

سفرنامے کی تحریر میں اس کا لکھنے والا عموماً بے تکلف ہوتا ہے اور انھیں احوال کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کا اس کے قلب وذہن پر اثر پڑا ہو اس سے وہ مضمون ادبی روح کا حامل بن جاتا ہے۔ اب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو کیسی ادا اور کامیاب ترجمانی حاصل ہو۔ یہ ہنر جس قدر جس کے قلم میں پیدا ہوجائے اس کا سفرنامہ اتنا ہی ادبی خوبی کا حامل بن جاتا ہے۔

اللہ رب العزت کا کلام، فصاحت وبلاغت، کمالِ ادا خوبیٔ اظہار

اور قوتِ تاثیر کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا وصف ''عربی مبین'' بتلایا ہے، اس کا یہ وصف قرآن کے حکیمانہ، سلیس اور بلیغ طرز ادا اور مؤثر و دل نشیں طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف پورا فصاحت و بلاغت کا معیار اعلیٰ ہے، دوسری طرف اس کا عظیم اور اہم مقصد نعم الٰہیہ کی تذکیر، حق کی طرف رہنمائی، دنیا و آخرت کی مفید و مضر باتوں سے واقف و باخبر کرنے اور زندگی کو سدھارنے کی تلقین پر مشتمل ہے، اسلوب کلام مختلف اور متنوع ہے، کہیں حکایت و قصہ کا انداز ہے، کہیں خطابت کا، کہیں مکالمہ ہے اور کہیں واقعہ بیانی، کہیں پند و نصیحت ہے اور کہیں تلقین و موعظت، حکایت بیانی کا انداز خاص طور پر سورہ یوسف اور سورہ قصص وغیرہ میں، خطابت کا سورہ حج اور سورہ مومن وغیرہ میں، اور مکالمہ کا انداز متعدد و مختلف سورتوں میں جہاں بھی دو شخصوں کے درمیان گفتگو کا موقع آیا ہے، ملتا ہے، نمونے کے طور پر سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں دیکھا جا سکتا ہے، تلقین و نصیحت سورہ لقمان اور سورہ اسراء وغیرہ میں خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

مضامین بالا کے علاوہ ایک مضمون ذکر سفر بھی ہے، بیان سفر ادب کی ایک مفید و دلچسپ اور معلوماتی صنف مانی گئی ہے، اس کے اندر ایسے حالات و واقعات اور نئے مشاہدات کا بیان ہوتا ہے، جو انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور اس میں آئی ہوئی باتوں سے استفادہ بھی ہوتا ہے، جو اس کی زندگی میں نئی ہوتی ہیں، یا پڑھنے والے کے لئے استعجاب کا باعث بنتی ہیں کبھی بیانِ سفر کے مشتملات اس کے اندر ایک خاص تأثر اور اثر پیدا کرتے ہیں، اور اگر کچھ نہ سہی تو معلومات میں اضافہ تو کرتے ہی ہیں۔ ہمیں قرآن مجید میں ایسے متعدد مقامات ملتے ہیں جہاں سفر کے حالات و واقعات کا

بیان ہے، اس کی بہترین مثال سورہ کہف میں مذکور حضرت موسیٰ کا قصہ ہے جنھوں نے نیک مرد کی ملاقات کے لئے سفر کیا تھا، جسے اللہ نے ایسے علوم سے نوازا تھا جو اس نے موسیٰ کو نہیں دیئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں نیک مرد سے ملاقات کرنے کا حکم دیا، اور ان کا تذکرہ "عبد من عبادنا" کے لفظ سے کیا ہے، ان کا نام خضرؑ تھا جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے، چنانچہ موسیٰ ان کی تلاش میں نکلے، قرآن کریم نے ان کے سفر کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور کوئی اہم بات نہیں چھوڑی جس کا تذکرہ نہ کیا ہو، یہ سفر ایڈونچر اور دلچسپی سے پُر ہے، قرآن کے بیان کے مطابق موسیٰؑ اپنے ایک معاون رفیق سفر کے ساتھ نکلے، جن کا تذکرہ قرآن نے "فتاہ" کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ موسیٰ نے سفر کی درازی کے باوجود اپنی منزل مقصود تک پہونچنے اور نیک مرد سے ملاقات کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا، قرآن اس کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کرتا ہے: "وَاِذْقَالَ مُوْسیٰ لِفَتَاہُ لا اَبْرَحُ حَتی اَبلغ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْاَمْضِیَ حُقُباً" موسیٰؑ نے اپنے ساتھ زاد سفر بھی لے لیا تھا، زاد سفر میں ایک مچھلی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ان مطلوبہ نیک مرد کے ملنے کی جگہ کی علامت قرار دی تھی، کہ جہاں یہ مچھلی اُچھل کر سمندر میں چلی جائے اسی جگہ ان سے ملاقات ہوگی، چنانچہ مچھلی سمندر میں چلی گئی، لیکن موسیٰ کو اس کا علم نہ ہوسکا، ان کے رفیق نے مچھلی کا جانا دیکھا تھا لیکن موسیٰؑ سے اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے تھے، موسیٰؑ نے اپنا سفر جاری رکھا اور منزل مقصود سے آگے نکل گئے، اور پھر راستہ میں کھانے کے لئے رفیق سفر سے مچھلی مانگی، اس وقت تکان بھی لاحق ہوچکی تھی اور کھانے کا وقت بھی ہوچکا تھا، اس وقت انھیں مچھلی کے پانی میں جانے کا

علم ہوا، چنانچہ انھیں راستوں پر چلتے ہوئے دوبارہ لوٹے تا کہ جس مقام پر مچھلی ان کے توشہ دان سے نکل کر پانی میں گئی تھی، وہاں پہنچ جائیں، تب وہاں انھوں نے خضر کو پایا، اور ان کے ساتھ رہنے کی درخواست کی، خضرؑ نے اسے قبول کرلیا لیکن یہ شرط لگادی کہ وہ کسی بھی کام کے متعلق جو اس سفر کے دوران خضر کریں، ان سے کوئی سوال نہ کریں اور موسیٰؑ نے اس کا وعدہ فرمالیا۔

اس سفر نامہ میں ہمیں مختلف انسانی اور معاشرتی پہلوؤں کا بیان ملتا ہے، مثلاً مقصد تک پہونچنے کی لگن، اس کی خاطر مشقت سفر برداشت کرنا، سفر میں تکان وتعب محسوس کرنا، کھانے کی ضرورت اور اس کی طلب، دو دوستوں اور ساتھیوں کے درمیان تازہ پیش آنے والے واقعات سے متعلق تبادلۂ خیال اور اس سلسلہ میں ردوقدح وغیرہ، اس سفر میں موسیٰؑ اور ان کے رفیق سفر، نیز موسیٰؑ اور ان نیک بندہ کے درمیان جن کی طلب وتلاش میں انھوں نے یہ ساری مشقتیں برداشت کیں، ہمیں دلچسپ مکالمہ بھی ملتا ہے، موسیٰؑ کی اپنے نوجوان رفیق سفر کے ساتھ گفتگو جو سفر کے پہلے مرحلہ میں ہوئی، تکان کے احساس اور کھانے کی ضرورت کے بیان پر مشتمل ہے، قرآن اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

فلما جاوزا قال لفتاه اٰتنا غدآءَ نا لقد لقينا من سفرنا هذا نصبا ۝ قال اَرَاَيت اِذاَ ويناۤ اِلى الصخرة فاِنى نسيت الحوت ، وما اَنسانيه اِلّا الشيطان أن اذكره ج واتخذ سبيله فى البحر عجبا ۝ قال ذالك ما كنا نبغ فارتدّا علىٰ اٰثارهما قصصا ۝

اور عبد صالح خضرؑ کے ساتھ ان کی گفتگو کو جو روو قدح پر مشتمل تھی، قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

قال له موسیٰ هل اَتبعك علیٰ اَن تعلمنِ مما علمتَ رشداً ۝ قال اِنّك لن تستطیع معی صبرا ۝ و کیف تصبر علیٰ مالم تحط به خبراً ۝ قال ستجدنیٓ اِن شاء الله صابرا وّلا اَعصی لك اَمراً ۝ قال فاِن اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیٍٔ حتیٰ اَحدثَ لك منه ذکراً ۝ فانطلقا ۔

اب ان دونوں حضرات کا سفر شروع ہوا، اور موسیٰؑ ان کے ساتھ روانہ ہوئے، اور دونوں ایک کشتی پر سوار ہوئے جو نئی تھی، اور اس کے مالک نے ان کو بغیر اجرت کے سوار کر لیا، لیکن حضرت خضر نے کشتی میں ایک جگہ توڑ پھوڑ کر کے اسے عیب دار کر دیا، موسیٰؑ کو اس پر اعتراض ہوا، اور انھوں نے فرمایا: آپ نے اس میں توڑ پھوڑ کر دی اس کے نتیجہ میں تو سبھی ڈوب کر مر جائیں گے، خضر نے انھیں ان کا وعدہ یاد دلایا، تو موسیٰ نے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اب دوبارہ سوال نہیں کریں گے، اور پھر دونوں حضرات چلے، راستہ میں کچھ بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے تو خضر نے ان میں سے ایک بچہ کا گلا دبا دیا اور وہ مر گیا، موسیٰؑ اس پر صبر نہ کر سکے اور ان کے ذہن پر انسانی احترام کا جذبہ غالب آ گیا، لہٰذا اس فعل پر اعتراض کیا اور کہا: آپ نے بغیر کسی قصور کے ایک معصوم بچے کی جان لے لی، آپ نے بہت غلط کام کیا، حضرت خضر نے پھر انھیں ان کا وعدہ یاد دلایا تو موسیٰؑ نے پھر معذرت کی، اور وعدہ کیا کہ آئندہ کچھ نہ پوچھیں گے، اور اگر پوچھیں تو وہ اس پر راضی

ہیں کہ ان کا ساتھ ختم ہوجائے، اس قول وقرار کے بعد پھر دونوں حضرات آگے کو روانہ ہوئے اور ایک بستی میں داخل ہوئے، دونوں بھوکے تھے اور کھانے کی ضرورت تھی، وہ بستی والوں کی طرف سے منتظر رہے کہ وہ ان کی ضیافت کریں گے، اور کھانا دیں گے، جیسا کہ اس زمانہ میں مسافروں کے ساتھ ہر بستی والوں کا معمول تھا، لیکن اس بستی والوں نے ان کی ضیافت نہیں کی، اور ان کو بھوکا رہنے دیا، پھر دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو بوسیدہ تھی اور گرا چاہتی تھی، تو خضر نے اس کی مرمت کردی اور بغیر اجرت اور معاوضہ کے مرمت کی، اس پر موسیٰ نے تعجب کا اظہار کیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ ہم بھوکے ہیں، اور ان لوگوں نے ہماری ضیافت بھی نہیں کی، تو آپ نے اس کام کی اجرت کیوں نہ لے لی، جس سے ہم کھانا حاصل کرنے میں مدد لیتے، اس پر ان بزرگ نے فرمایا: ہمارا تمہارا معاہدہ اب ختم۔ کیونکہ تم نے جو واقعات دیکھے ان پر صبر نہ کرسکے، لہٰذا اب میں اپنے کاموں کا جواز تمہیں بتلاتا ہوں اور اس راز سے پردہ اٹھاتا ہوں جس پر تمہیں تعجب ہوا، پھر انھوں نے بیان کیا کہ کشتی میں سوراخ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقہ کا بادشاہ ظالم تھا اور جو بھی اچھی اور صحیح کشتی دیکھتا اس پر قبضہ کرلیتا، اور زبردستی چھین لیتا تھا، لہٰذا میں نے اسے عیب دار کردیا تاکہ اس کی نگاہ میں یہ اچھی نہ لگے، رہا دوسرا واقعہ بچہ کے قتل کا تو وہ اپنے والدین کا نافرمان اور سرکش تھا، اور والدین نیک اور صالح تھے، اس لئے اللہ نے دونوں کو اس کے شر سے بچانا چاہا اور مجھے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں انھیں صالح اولاد دے گا۔

دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس کے نیچے دو چھوٹے یتیم بچوں کا خزانہ

مدفون تھا، ان کے والد انتقال کر چکے تھے، جو بڑے نیک تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ خزانہ دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہے تا کہ اس پر قبضہ نہ ہو، اور دیوار کمزور تھی اور گرنے ہی والی تھی اس لئے میں نے اس کی مرمت کر دی، تا کہ خزانہ اس کے نیچے محفوظ رہے اور یہ سارے کام میں نے اپنے رب کے حکم سے کئے ہیں، اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کیا ہے، پھر سفر نامہ اس نقطہ پر آ کر ختم ہوتا ہے جہاں حضرت خضر فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے، اور یہ ان واقعات کی تاویل و توجیہہ ہے جس پر تم سے صبر نہ ہو سکا۔

یہ سفر کے واقعات تھے، اور حالات یہ تھے کہ موسیٰؑ جب اس سفر پر روانہ ہوئے تھے تو اپنے ساتھ ایک معاون رفیق سفر کر لیا تھا اس سے اس دور میں مسافروں کے معمول کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ مسافر تنہا سفر نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے ساتھ کوئی رفیق اور معاون بھی لے لیتا تھا۔

حدیث شریف کا ادبی امتیاز

الحمدللہ رب العالمین ، و الصلاۃ و السلام علی خاتم المرسلین سیدنا محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد !

حضرات! رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین تھے، انسانوں کی ہدایت اور راہ حق کی نشاندہی اور وضاحت کے لئے رب العالمین کی طرف سے بھیجے گئے تھے، ان کی زندگی کا کام و پیغام دین حق کا پہنچانا اور شریعت اسلامی کی وضاحت تھی، لیکن وہ رسول ہونے کے ساتھ ساتھ انسان تھے، انسانی احساسات، تأثرات، معاملات سے ان کو بھی اسی طرح واسطہ پڑتا تھا، جس طرح کسی انسان کو پڑتا ہے، دعوت دین کی راہ میں ان کو صعوبتیں پیش آتی تھیں، وہ ان صعوبتوں کو انسان ہونے کے ناطے محسوس کرتے تھے، اہل تعلق سے محبت، حوادث پر رنج، خوشی کے موقع پر مسرت آپ کو بھی انسانوں کی طرح ہوتی تھی، جہاں ان احساسات و تأثرات کے اظہار کا آپ موقع محسوس کرتے، ان کا اظہار فرماتے تھے، اسی طرح آپ نے اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ کی وفات پر اپنے تأثر و رنج کا

اظہار فرمایا جس میں ایک طرف آپ کی عبدیت اور احتیاط کا پورا اظہار ہے، دوسری طرف انسانی تأثر کے سچے اظہار کے لئے بہت فصیح اور مؤثر طرز ادا ہے، فرمایا: "القلب یحزن ، والعین تدمع، ولا نقول إلا مایرضی الربّ، وأناعلی فراقك یا ابراهیم ! لمحزون" (دل رنجیدہ ہے آنکھ میں آنسو آرہے ہیں، لیکن ہم وہی کہتے ہیں جس سے رب راضی ہو، ہم تمہاری جدائی سے اے ابراہیم رنجیدہ ہیں) ذرا حقیقت کی عکاسی دیکھئے اور طرز ادا کی احتیاط دیکھئے، کیا یہ ادب نہیں؟

آپؐ نے ایک موقع پر خواتین کی نزاکت کی کیفیت کا لحاظ اپنی عبارت میں اس طرح فرمایا کہ کہا: "رفقاً بالقواریر" اس میں آپؐ نے خواتین کو آبگینوں سے تشبیہ دی، ایک موقع پر آپسی اختلاف کی گنجائش نہ بتاتے ہوئے فرمایا: "لا ینتطح فیه عنزان" یعنی اس معاملہ میں دو بکریاں آپس میں سینگ نہ لڑائیں گی، ذرا بکریوں کے یہ انداز سامنے رکھئے کہ دو بکریاں جب اکٹھا ہوجاتی ہیں، اپنے اگلے پیروں کو اٹھا کر سینگ لڑاتی ہیں، آپؐ نے اس انداز کو دو شخصوں کی آپسی کشمکش کے اظہار کے لئے انتخاب کیا، اسی طرح آپ کا یہ فرمانا کہ "هذا یوم له ما بعده" یعنی آج کا دن ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ بعد میں چلے گا، ذرا اس طرز ادا کو دیکھئے، کتنے اچھے طریقہ سے کسی قضیہ کے کسی نہ کسی شکل میں جاری رہنے کا امکان بتایا گیا ہے۔

یہ تو جملے تھے، آپؐ کے اس خطبے کو دیکھئے جو آپؐ نے ہوازن سے واپسی پر مال غنیمت کی تقسیم میں بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے دیا، اور آپ کی مختلف دعاؤں کو دیکھئے، کیسی باریکی اور نفسیاتی کیفیت کا لحاظ اور

تأثرات کی سچی ادائیگی ملتی ہے، اس میں اپنی عبدیت اور پروردگار کی عظمت کا پورا احساس اُجاگر ہے۔

مؤثر اور فصیح طرز ادا اور دل کو متحرک کر دینے والی تعبیر، دعوت دین کے کام کے لئے ایک ضروری اور مؤثر ذریعہ تھا، امت کی رہنمائی اور تعلیم و تزکیہ کے لئے بھی اس کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی صلاحیت آپ کو بدرجہ اتم عطا فرمائی گئی تھی، بہر حال آپ کی فصاحت اور حسن ادا جو آپ کی گفتگو، خطابت، نصیحت اور اپنے رب کے سامنے اظہار عاجزی، حمد و مناجات میں کھلے طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے، آپ کی فصاحت کلام و حسن بیان پر سب کو اتفاق ہے، عربوں میں صحت کلام و فصاحت کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی تھی، وہ بھی آپ کو بدرجۂ اتم حاصل تھے، آپ فصیح ترین قبیلہ قریش میں پیدا ہوئے، پھر قبیلہ بنی سعد میں رضاعت کا زمانہ گذارا یہ قبیلہ فصیح قبائل میں شمار کیا گیا ہے، پھر پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ خیالات و احساسات آپ کا طرز رہا، پھر نبوت ملی تو بلاغت و اعجاز بیان کا معیاری کلام قرآن مجید آپ پر اتارا جانے لگا، وہ آپ کا اصل معلم و مربی تھا، آپ کا قلب و ذہن اور آپ کا اسلوب بیان سب نے اس آسمانی معلم سے کسب فیض کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں ایک طرف مناجاتیں اور دعائیں ہیں وہاں دوسری طرف قابل قدر اشخاص اور محبین کے ساتھ محبت و تعلق کے بلیغ جملے ہیں اور اغیار سے گفتگو میں جو کلام فرمایا ہے اس میں موقع و محل کی نزاکت کا مؤثر لحاظ ہے۔ آپ نے ایک بچہ سے جس کا پالتو پرندہ مر گیا تھا پیار و شفقت کے لہجے میں لیکن لفظ کے صوتی حسن کے

ساتھ فرمایا "یا عمیر مافعل نغیر ؟" ارے عمیر تمہارا بلبل کیا ہوا، آپ نے بنی عبد قیس سے جو آپ کے قبیلہ قریش کی نظر میں اغیار تھے ملاقات کے لئے آنے پر زیادہ دلداری اور ملاطفت کا اظہار موثر و دلنواز اسلوب میں بیان فرمایا: "مرحبا بالقوم غیر خزایا و لاندامی" آپ لوگوں کو بہت بہت خوش آمدید آپ کو کوئی بے احترامی کا معاملہ نہیں ملے گا، اور نہ آپ کو آنے پر افسوس ہوگا" اس سب کے علاوہ آپ کی زبان مبارک سے متعدد موقعوں پر ایسے جملے نکلے جو کہاوت اور مثل بن گئے اور آج تک ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

پھر آپ کی گفتگو اور خطاب کو دیکھئے تو وہاں ادبی حسن و تاثیر کی پوری چھاپ ملتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ آپ کا حضرات انصار سے موثر خطاب، آپ کا حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب، آپ کی وہ دلنشیں تشریح جو آپ نے یہ مثال دے کر کہ "برا کام کرنے والوں کو اگر ان کے رفقاء نے ان کے برے کام سے نہ روکا تو ان کی ایسی مثال ہوگی کہ کسی دو منزلہ کشتی پر اوپر بیٹھے لوگ نچلی منزل میں بیٹھے لوگوں کو اگر دیکھیں کہ وہ دریا سے پانی لینے کے لئے اپنی منزل کے پیندے میں سوراخ کر رہے ہیں اور وہ دوسروں کی مصیبت سمجھ کر ان سوراخ کرنے والوں کو نہ روکیں گے تو دونوں منزل کے سوار تباہ ہو جائیں گے،" اسی طرح آپ نے اس کی رہنمائی کی وضاحت کرتے ہوئے جو آپ تمام لوگوں کے لئے لائے پھر کچھ لوگوں نے مانا، اور کچھ لوگوں نے نہ مانا، آسان اور دلنشیں اسلوب میں مثال دیتے ہوئے کہا: "کہ بارش کا پانی زمین پر بہتا ہے مقامی زمین کو سیراب کرتے ہوئے دور کے لوگوں کو بھی بہہ کر پہنچتا ہے۔ اس طرح

دونوں زمینوں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ لیکن کچھ زمین سپاٹ پتھر کی طرح ہوتی ہے، پانی سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ ادھر ادھر بہا کر ضائع کر دیتی ہے۔" آپ نے اس مثال سے زمینوں کے حقیقی فائدہ اٹھانے والے اور اس علم کو ضائع کر دینے یا ناقابل قبول سمجھنے والوں سے بڑے سہل اور بلیغ انداز میں تشبیہ دی آپ نے اپنی زوجہ مطہرہ کی دلداری کے لئے ان سے دلچسپ اور ادبی زبان میں ایک تبصرہ سنا جس میں متعدد بیویوں نے اپنے اپنے شوہروں کے بارے میں اظہار رائے کیا تھا وہ تبصرہ حدیث ام زرع کے نام سے حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ اسی طرح آپ نے ایک موقع پر اپنی سواری پر شریک سواری سے جاہلیت کے دور کے ایک شاعر کا کلام کہہ کہہ کر سنا کلام اچھا اور دین کی حمایت میں تھا، آپ نے سن کر فرمایا کہ ان اشعار کے شاعر کی زبان نے اسلامی مزاج کے مطابق کام کیا لیکن اس کا دل کافر ہی رہا۔ آپ نے کعب بن زہیر سے اپنی مدح میں قصیدۂ مدحیہ سنا اور باوجود اس کے کہ اس کے قصیدہ میں جاہلی دور کا پورا انداز تھا لیکن وہ نیا نیا مسلمان ہو رہا تھا اس کو اسلام کا تقاضہ اور طرز معلوم نہ ہو سکا تھا لہٰذا آپ نے صرف سنا ہی نہیں بلکہ اس پر انعام بھی دیا۔ اس کے علاوہ آپ اپنے صحابہ کرام کے شعر کہنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بلکہ مسلمان ہو جانے والے شاعروں کو اپنی شاعری دین کی حمایت میں استعمال کرنے کا حکم دیتے۔ آپ نے خود شاعری نہیں کی لیکن نثر میں بڑی بلاغت اور ادبیت ظاہر فرمائی، آپ نے انسانی سرشت بتاتے ہوئے ایک بار ایک واقعہ قصہ کی شکل میں اور سہل انداز میں بیان کیا۔ اس قصہ میں ایک نابینا، ایک گنجے اور ایک کوڑھی کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا اور اس طرح

کی بے شمار مثالیں ہیں۔ جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے انسانی فطرت و احساسات اور نفسیاتی حال کی عکاسی آپ کے کلام بلاغت نظام میں بکثرت ملتی ہیں۔ جو ہم کو متوجہ کرتی ہیں کہ ادب اسلام سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ لیکن وہ اسلام کے سایہ میں صحت مندانہ انداز سے چلتا اور کام کرتا ہے۔ اور ہماری مراد اسلامی ادب سے وہی ادب ہے جو زندگی کی رہنمائی انسان کی صحت مندانہ مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق کرتا ہو، اور باوجود تنوع اور وسعت کے صحت مندانہ دائرہ سے باہر نہ چلا جائے۔ ایسا ادب نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت ہے بلکہ تمام انسانوں کی ضرورت ہے۔ وہ انسانی قدروں کا محافظ اور انسانوں کی خوشی و رنج میں شریک مسرت و غمگسار الم بھی ہے، اس کی سرشت اسلامی ہے مذاق انس و ہمدردی ہے، دائرہ کار میں زندگی اور پوری انسانیت کو عہد نبوت سے شروع ہو کر آئندہ مستقبل کے اندر دور تک پھیلا ہوا ہے۔

سوانحی ادب ایک دلنواز ادب

سوانحی ادب بڑا متنوع اور دوررس اثرات کا حامل ادب ہے۔ یہ صاحب قلم کو اس کے ذوق وفکر اور اسلوب بیان کے لئے اچھا میدان کار مہیا کرتا ہے اور تذکرہ نگار اپنے اندازے اور مشاہدے اور اپنے مقصد کے لحاظ سے اس کو ظاہر کرتا اور ادا کرتا ہے، اس موضوع کا جو علمی حق ہے بعض اہل قلم اس کو بہت اچھی طرح ادا کرتے ہیں، لیکن بعض اہل قلم اس کے ادا کرنے میں قاصر بھی رہے ہیں۔ بعض اہل قلم اس میں افسانہ نگاری کے فن کی آمیزش کر دیتے ہیں، اور بعض اہل قلم اپنی ذاتی فکر ونظر کو پیش کرنے کے لئے اس موضوع کے نام کی تختی استعمال کرتے ہیں، اس طرح یہ موضوع مختلف انداز کا شکار بھی بنا ہے اور متنوع صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ اس میں قاری صرف سوانح کو ہی نہیں پڑھتا بلکہ اس کے ساتھ راقم سوانح کو بھی پڑھ لیتا ہے۔

اسلام میں سوانح نگاری کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے ملتا ہے اور سیرت نبوی کی تصنیف کا آغاز ''مغازی'' کی احادیث سے ملتا ہے۔ اور اس کام میں محمد بن اسحاق کا نام اولین حیثیت رکھتا ہے۔

ان ہی کی روایات کی بنیاد پر ابن ہشام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ تیار کی، جو اپنی متعدد خوبیوں کی بنیاد پر سیرت نبوی کے باب میں بہت امتیاز رکھتی ہے۔ اور اس کا اسلوب بیان ادبی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔

عصر عباسی کے آغاز کے ساتھ عربوں میں علوم وفنون کی تدوین کا عہد شروع ہو گیا تھا، جس نے ترقی کر کے اس کو ایسے کمال تک پہنچایا جو اسلامی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ اس میں شخصیتوں کے حالات قلم بند کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جس کی بڑی ضرورت احادیثِ رسولؐ کے راویوں کے مقام اور صفات کو جاننے کے لئے ان خصوصیات اور زندگی کے اہم حالات کو محفوظ کر دینے سے پڑی، جو کہ "اسماء الرجال" کے نام سے ایک مستقل فن بن گیا۔ شخصیتوں کے حالات محفوظ کرنے کا کام "طبقات" کے عنوان سے رواۃِ حدیث کے علاوہ اہم شخصیات کے لئے بھی کیا جانے لگا۔ اس میں "طبقات ابن سعد" کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ پھر اہل علم کے مختلف گروہوں کے لئے علاحدہ علاحدہ طبقات پر بھی کتابیں تصنیف کی گئیں، ادب کے تعلق سے بھی ممتاز شخصیتوں کے حالات قلم بند کیے گئے۔ پھر بتدریج اہم ترین شخصیات پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں، اسی طرح کے مصنفین میں "علامہ ابن الجوزی، علامہ یاقوت حموی اور قاضی ابن خلکان" کے نام نمایاں ہیں۔

تذکرہ نویسی کا داعیہ بعض وقت اپنی کسی پسندیدہ شخصیت کی زندگی کو دوسروں میں متعارف کرنے کا ہوتا ہے، اور بعض وقت یہ کام صرف علمی وتحقیقی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ اول الذکر صورت میں مصنف اگر پوری احتیاط اور قلمی دیانت سے کام نہ لے تو سوانح، مدح وستائش کے بعض غلو والے

پہلوؤں کی حامل بن جاتی ہے، چنانچہ بزرگ شخصیتوں کے بعض تذکروں میں اس طرح کا غلو ملتا ہے، ان کے تذکرہ میں بعض بعض تصنیفیں کرامات اور غیر معمولی اوصاف کے ذکر کی حامل ملتی ہیں۔ اور بعض میں تو یہ فرق بھی کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ انسان کی سوانح ہے یا کسی مافوق الفطرت ذات کی، لیکن علمی انداز کی پابندی رکھنے کی صورت میں سوانح اپنے قارئین کے لئے ایک مؤثر تر تبتی ذریعہ بن جاتی ہے، جب شخصیت بڑی ہو، اپنی صفات میں ممتاز ہو اور اس کی زندگی کی تصویر کشی اس کو انسان رکھتے ہوئے ہو تو وہ سوانح ایک مؤثر اور طاقتور تحفہ بن جاتی ہے اور لکھنے والا اگر تحریر کی ادبی رعایتوں کا لحاظ رکھتا ہے تو تذکرہ علمی خوبیوں کے ساتھ ادبی خوبیوں کا بھی حامل بن جاتا ہے۔

اس کی مثالیں ہر زبان میں ملتی ہیں۔ ہماری اردو زبان بھی اس سے مالا مال ہے اور اس میں دار المصنفین کا حصہ بہت نمایاں ہے۔

سیرت نبوی بھی اگر چہ ایک سوانح ہے لیکن اس کے لکھنے والوں کا تعدد و تنوع اور اس عظیم شخصیت کے اوصاف کی ندرت و رعنائی کی وجہ سے اس حد تک بڑھا ہے کہ وہ سوانح نگاری میں بالکل علاحدہ اور مستقل باب بن گئی ہے۔ اور اب سیرت نبوی سوانح نگاری کا جزء ہونے کے بجائے خود اپنی علاحدہ حیثیت کی مالک بن گئی ہے، جس پر گذشتہ صدیوں میں برابر کام ہوتا رہا ہے اور برابر جاری ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح مدحیہ شاعری میں نعتیہ کلام کو علاحدہ فن کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور اس پر اہل فن علاحدہ صنف کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

سوانح نگاری میں خود نوشت سوانح نے بھی اپنا ایک مستقل مقام

بنالیا ہے، اور اس میں چونکہ راوی صرف راوی یا مشاہد نہیں بلکہ خود اصل ہوتا ہے اس لئے جو تصویر کشی وہ کرتا ہے وہ دوسرا نہیں کر سکتا، اور جب آپ بیتی لکھنے والے کا قلم ادب شناس ہو تو بات کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔

خود نوشت سوانح میں صاحب قلم کے انداز فکر و ذوق کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے، اور خود نوشت سوانح لکھنے والا جب ادیب ہو تو اس کی ادبی خصوصیات بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ اس میں بیان اپنا ہوتا ہے اور اپنے احساسات و تصورات کا علم اور اس کو فنی طریقہ سے ادا کرنے کا سلیقہ اس کو زیادہ ہوتا ہے، اس طریقہ سے سوانح نگاری کا فن ایک متنوع اور لطف کا حامل فن بن چکا ہے۔

ملفوظات ومواعظ

ادب کے آئینہ میں

ادب کا علم کے ساتھ امتزاج علم کے فائدہ کے ساتھ ادب کی لذت کو شامل کر دیتا ہے اور ادب میں لطف کے ساتھ افادیت کا اضافہ کر دیتا ہے، روکھا سوکھا علم عموماً دل پر جبر کر کے اور فائدہ کے حصول کے لئے ایک انسانی فریضہ سمجھ کر طلب کیا جاتا ہے اور بے مقصد ادب لذت ولطف کا حامل ہوتا ہے لیکن اس سے انسان کی کوئی قابل ذکر ضرورت پوری نہیں ہوتی ادب کو بے مقصد بنا دینے والوں نے دراصل اپنی خواہش نفس کو صالح انسانی قیود سے آزاد کرا لینے کی یہ ایک تدبیر کی اور اس طرح انھوں نے ذوق وفن کے نام پر صدیوں کی بنی ہوئی اقدار سے اپنے کو آزاد کر لینے کی تدبیر کی۔

انسان نے انسانی اقدار سے آزادی حاصل کرنا چاہی تو اس کے ضمن میں ادب کے دائرے کے اندر بھی اپنی قدیم اقدار سے باہر ہونے لگا، اور اس نے زندگی کا ایسا چمن بنانا چاہا جس میں حسن کو قبح اور قبح کو حسن اور مفید کو مضر اور مضر کو مفید بنا دیا۔

عصر جدید کا انسان یورپ سے آئے ہوئے ادبی نظریات وفلسفوں کی حکمرانی میں آ گیا ہے اس کے نتیجہ میں ادب نے بھی ان فلسفوں کے اثر سے نئے چولے اختیار کر لئے ہیں، جن کی وجہ سے حال کو دیکھتے ہوئے ہمارے انسانی اقدار کے ماننے والے ادباء کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کریں اور ادب کی صالح اقدار کو بے دینی اور بداخلاقی کا ترجمان بنا دینے کا مقابلہ کریں، اور اس کو انسانی مصلحت اور اخلاقی اقدار کا حامل بننے کے راستہ پر واپس لائیں۔

انسانی معاشرہ کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اس میں اس کے ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ تعاون و ہمدردی کا جذبہ کام کرتا ہے، باپ کو اپنے بیٹے سے بیٹے کو اپنے باپ سے بھائی کو بھائی سے دوست کو دوست سے رفیق سفر و رفیق کار کو اپنے رفیق سفر اور رفیق کار سے ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اس کا خیر خواہ ہوتا ہے اس کو اپنی مصلحت کے ساتھ اپنے اس تعلق والے کی مصلحت سے بھی دلچسپی ہوتی ہے یہ دل چسپی ذہنی بھی ہوتی ہے اور قلبی بھی ہوتی ہے۔ اور کسی کی مصلحت طلبی میں قلب و ذہن دونوں شریک ہو جائیں تو اس میں ایک خاص قسم کی تاثیر اور طاقت شامل ہو جاتی ہے۔ اس تاثیر و طاقت کو اگر الفاظ میں ادا کر دیا جائے تو الفاظ کا یہ مجموعہ ایک شاندار ادب بن جاتا ہے اور اس کا بڑا حصہ بہت سے مواعظ و ملفوظات میں ملتا ہے۔

ادب کی تاریخ میں کلام انسانی کے اس طرح کے نمونے جا بجا ملتے ہیں، جا بجا ملنے والے یہ نمونے وہ ہوتے ہیں جن کو کتابوں نے محفوظ کر لیا ہے، اور قدیم نمونوں کی جھلک ہم کو قرآن مجید میں ملتی ہے۔ جس میں قدیم قوموں اور ان کے انبیاء کا تذکرہ ہے، انبیاء نے اپنی قوموں کو

ان کے فائدے کی جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اس کے جستہ جستہ تذکرے ملتے ہیں، حضرت نوحؑ قدیم ترین قوم کے نبی تھے، ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو نصیحت کرتے اور سمجھاتے رہے اس بات کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا اور بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ نے دل کی گہرائیوں سے اپنی قوم کو نصیحت کی ان کے انداز کلام کا ذکر کیا ہے۔ اس کو پڑھیے تو دل پر اثر پڑتا ہے ان کے بعد آنے والے نبیوں کی نصیحتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں حضرت لقمان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان نصیحتوں میں حکمت و موعظۂ حسنہ کا عنصر پوری طرح غالب ہے۔ حکمت یہ کہ موقع و محل کا خیال رکھ کر اور سننے والے کی ذہنی کیفیت کی رعایت کرتے ہوئے بات کہی جائے اور موعظۂ حسنہ یہ کہ ایسے انداز سے مخاطب کیا جائے کہ بات دل کو لگتی معلوم ہو، بات دل لگتی اس وقت ہوتی ہے جب وہ صرف ذہن کو مخاطب نہ کرے بلکہ قلب تک پہنچے، ادب کے سلسلے میں سب سے بڑی گر کی بات یہی ہے کہ وہ قلب تک پہونچے، زبان کے الفاظ صرف سیدھا سادہ مطلب ہی ادا نہیں کرتے بلکہ وہ مطلب کے ساتھ ساتھ ان سے دل کے احساس و تأثر کی جو کیفیت وابستہ ہو جاتی ہے اس کو ادا کرنے کی بھی ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک ادیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے وابستہ ان کیفیتوں کو سمجھتا ہو اور پھر ان کے مطابق الفاظ اختیار کرتا ہو اور اگر بات خود ادیب ہی کی ہے تو پھر اس کا یہ عمل فطری عمل بن جاتا ہے۔ ہم کو ادیب دونوں طرح کے ملتے ہیں ایک وہ جن کی خود اپنی واردات ہوتی ہے ان کا ادب فطری ہوتا ہے دوسرے ادیب وہ ہوتے ہیں جن کی واردات خود ان کی نہیں ہوتی ہیں وہ محاکات سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کی واردات کو اپنی قابلیت سے

بالکل فطری جیسا بنا لیتے ہیں۔

انسانی احساسات وجذبات کے لحاظ سے انسانوں میں بڑی مماثلت ویکسانی ہوتی ہے اس لئے کوئی آدمی اپنے عہد کے آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے اس طرح بات کرسکتا ہے کہ سننے والے کی واردات واحساسات کا پورا لحاظ کرے ہم کو نصیحت وموعظت کے تین ایسے بڑے شاندار نمونے ملتے ہیں، جن میں مخاطب کے احساسات وواردات کی رعایت پائی جاتی ہے، اور اس کی بنا پر نصیحت کرنے والے کا کلام بڑا پر اثر ہو جاتا ہے۔

انبیاء پھر نیک دل ونیک صفات کے حامل مصلحوں، مربیوں اور صوفیاء کے یہاں اس کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ

ادب آدمی کے احساسات وتصورات کو ایسے الفاظ وعبارت میں پیش کرنے کا نام ہے جو ان احساسات وتصورات کو ان کی فطری کیفیت وحرارت کے ساتھ منتقل کر سکتے ہوں، یہ منتقلی ان کی کیفیت وحرارت کے جتنی مطابق ہوتی ہے، اتنا ہی اس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کے احساسات اور تصورات کی گرمی اور کیفیت بڑی حد تک ان کے پس منظر کے واقعات اور حوادث سے تعلق رکھتی ہے، یہ احساسات وتصورات عام طور پر تکلیف دہ حالات ومعاملات میں تیز اور اثر انگیز بن جاتے ہیں اور اسی طرح قلبی راحت، ذہنی لطف ولذت اور دل پسند حالات پس منظر میں ہوں تو ان کے ادب میں ان کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور پورے عالم اسلام کے گذشتہ دوسو برس مسلمانوں کے لئے بڑی شکستگی اور کرب کے گذرے ہیں، ہندوستان اور عالم اسلام کے چپہ چپہ میں یورپ کی استعماری طاقتوں نے سیاسی ظلم وحق تلفی اور عسکری زور زبردستی سے کام لیا، ہندوستان میں عسکری سطح پر سلطان ٹیپو شہیدؒ کی

شہادت سے مسلمانوں کے دلوں پر جو زخم لگا وہ مندمل تو کیا ہوتا اس کے برعکس یہ ہوا کہ اس کے صرف نصف صدی کے بعد ہی ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی، جذبہ آزادی اور اسلام نوازی کے حاملین کو حس طرح چن چن کر قتل کیا گیا، اس کا بیان بھی روح فرسا ہے، لیکن غیرت مند اور باہمت افراد نے جدوجہد میں کوتاہی نہیں کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ماننے والوں کی جدوجہد اس سلسلہ میں ممتاز مقام رکھتی ہے، انھوں نے یہ جدوجہد صرف عملی میدان ہی میں نہیں علمی میدان میں بھی کی، اور اس سے بھی ایک ادب وجود میں آیا۔ اس وقت کے تکلیف دہ واقعات نے ان حضرات کے علاوہ دیگر تمام حساس مسلمانوں کے دلوں کو چھلنی کیا، ان میں جو ادباء اور شعراء تھے ان کے دلوں میں جذبات کرب والم ابھرے، اور ان کی نثر و نظم میں ڈھلے، انگریزوں کا کوڑا مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا تھا اس میں خوف واحتیاط کے ساتھ جتنا کہا جاسکتا تھا، وہ سلیقہ سے کہا جانے لگا، ہم کو اس کے اثرات علامہ شبلیؒ کی تحریر کردہ کتابوں کی مختلف عبارتوں میں اور ان کی قومی نظموں میں، اور اکبرالہ آبادی کے شعری طنزیات اور نظموں میں، اور مولانا حالی کی عظمت اسلام، پھر زوال و بربادی کی مؤثر شاعرانہ تصویر کشی میں ملتے ہیں، جن سے دکھے دلوں کی تسکین ہوتی تھی، اور حوصلہ کو مہمیز لگتی تھی۔ عظمتِ اسلام کے تذکروں سے نوجوانوں کا خون بڑھتا تھا، یہ اسلامی ادب کا ایک قابل قدر حصہ بنا، جس نے اسلامی عظمت کی تجدید کا جذبہ پیدا کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ صرف ہندوستان کے مسلمان ہی سامراج کے ظلم وچیرہ دستی کا شکار نہ تھے بلکہ ممالک اسلامیہ کے نشانِ عزت، خلافت عثمانیہ ترکی بھی مغرب کی سامراجی سازشوں کا شکار بنی ہوئی تھی، جو بالآخر ختم

کردی گئی، اس کے ختم ہونے کا اثر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات پر بے انتہا پڑا۔ اور اس کے نتیجہ میں زبردست خلافت تحریک شروع ہوگئی۔ مغربی سامراج نے صرف اسی پر بس نہیں کی، بلکہ اس کے اہل علم وادب اپنے اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کو مختلف انسانی خرابیوں سے متہم کرنے میں لگ گئے۔ ان میں سے اسلامی علوم وفنون کا علم رکھنے والے اسلامی تاریخ، سیرت نبوی، اسلامی شریعت میں سے ایسے ایسے اجزاء تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے جن کی غلط تشریح کے ذریعہ وہ اسلامی ثقافت وشرافت کو مشکوک وداغدار بنانے کا کام لیتے، چنانچہ مغربی درسگاہوں میں پڑھنے والے اور مغربی اہل قلم کی پیش کردہ اسلامی علوم وثقافت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے نوجوان سخت خلجان میں پڑ گئے، ایک طرف مغربی اہل قلم کی تحقیقی امانت ودیانت کا پروپگنڈہ ان کے سامنے تھا، دوسری طرف ان کے قلم سے اسلام ومسلمانوں کی بے توقیری ہورہی تھی، یہ وہ سب اسباب تھے جنھوں نے اہل غیرت مسلمانوں کے قلموں اور زبانوں میں جوش پیدا کردیا۔ جو اہل تصنیف کی تصنیفات میں اور اہل ادب کے ادبوں میں جھلکنے لگا۔ علامہ شبلی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر کی نظموں اور نثری پیکروں میں ان کے جذبات ملی اور احساسات اسلامی کے نمونے ملنے لگے، پھر مولانا ابوالکلام آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریروں میں اس کی جھلک نمایاں ہوئی، دوسری طرف دعوتی وکلامی لٹریچر، شگفتہ ودل آویز انداز میں ظہور میں آنے لگا، جس کا سلسلہ تا حال قائم ہے، اس نے اور دیگر اقسام کی ادبی کوششوں نے بہت سے مسلمان نوجوانوں کو شک ودین بیزاری سے بچالیا، اور بہت

سے نوجوانوں کے دلوں میں جذبہ وولولہ پیدا کردیا۔

برصغیر کے یہ اہل تحریر وتقریر اپنی مذکورہ بالا کوشش عموماً اردو میں پیش کرتے تھے، جو برصغیر کے مسلمانوں کی مشترک زبان رہی ہے، لیکن عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں ایسی کوشش اپنی اپنی زبانوں میں کی گئی، عرب دنیا میں ان کوششوں کا آغاز اسلامی عظمت کی بحالی کے مشہور داعی جمال الدین افغانی سے ہوا۔ اس میں ان کے خاص رفیق کار وشاگرد مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا ہوئے، شام میں عبدالرحمٰن کواکبی، عبداللہ ندیم اور ان کے علاوہ مصر وشام کے متعدد خالص ادب کے فاضلوں نے بھی اس سلسلہ میں حصہ لیا، ان میں خاص طور پر مصر کے مصطفیٰ صادق الرافعی، مصطفیٰ لطفی منفلوطی اور ان کے بعد متعدد ادباء اس فہرست میں نمایاں ہیں، شام وعراق کے متعدد سیاسی رہنماؤں کا بھی اس میدان عمل میں حصہ رہا، پھر اس کام میں زیادہ تیزی شیخ حسن البناؒ کی جدوجہد سے آئی، اور خود ان کے متعدد فاضل رفقاء کے ذریعہ بڑا کام ہوا، مغرب اقصیٰ میں عبدالحمید بادیس اور محمد البشیر الابراہیمی اس سلسلہ کے اہم اشخاص ہیں۔ ترکی میں شعراء اور ادباء کے زمرہ سے محمد عاکف اور مصلحین وسماجی کارکنوں میں شیخ سعید نورسی قابل ذکر ہیں۔

عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کو بحال کرنے کے تقاضہ وضرورت کے احساس نے اہل ادب واہل قلم کو متحرک کیا، اور ان کے ادب نے قابلِ ذکر خدمت انجام دی۔

مذکورہ بالا ادبی کاوشوں کا تعارف اس عہد میں ادب اسلامی کی اصطلاح سے نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اس دور میں ادب کی سرپرستی اور خدمت کرنے والے تمام لوگ اسلام پسند اور اسلامی قدروں پر یقین رکھنے والے

تھے، لیکن بتدریج مغربی تعلیم وثقافت کے اثر سے مذہب پسندی کو زوال آنا شروع ہوگیا، اور مذہب کے بارے میں تشکیک اور مادہ پرستی الحادی شکل میں اور خاص طور پر ادب کے علمبرداروں میں پھیل گئی، پھر کمیونسٹوں کے اثر ورسوخ کے بڑھنے سے ادب کو مذہب کے بالمقابل بنادیا گیا۔ اسلامی قدروں کو ادب کے لئے ایک غیر اور بیرونی خصوصیات کا حامل سمجھ لیا گیا، ایسی صورت میں اسلامی قدروں پر یقین رکھنے والوں کو ادب کے لئے بھی تحریک آزادی چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس طرح ادب اسلامی کی اصطلاح وجود میں آئی۔

تحریک آزادی واصلاح عوام میں

ادب اسلامی کا حصہ

ادب کا تعلق انسان کے احساس ووجدان سے بہت گہرا ہے وہ وجدان کی مدد سے ابھرتا ہے اور وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت و صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ وہ محقق و مفکر ہو اور خواہ جاہل وعامی اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے اسی لیے ادب کے ذریعہ سے کبھی اصلاح عوام کا کام لیا گیا، کبھی پوری پوری قوم کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈالنے کا کام لیا گیا، اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا۔

برصغیر میں برطانوی استعمار کے قدم یہاں کے قائدین وحکمراں کی سیاسی غلطیوں سے جمے، لیکن پھر عوامی سیاسی جدوجہد اور ادب کے مختلف ذرائع سے ان کے قدم اکھاڑے گئے، استعمار کے یہ قدم صرف سیاسی میدان ہی میں اکھاڑے نہیں گئے، بلکہ ذہنی وفکری میدان میں بھی اکھاڑے گئے، اس سلسلہ میں سیاسی میدان میں اگر سیاسی کوششوں کا خاصا دخل رہا تو ذہنی میدان میں اصل کام ادب نے کیا ہے، برطانوی استعمار سے

اثرات شروع ہونے کے وقت سے ادب کے میدان میں جو جد وجہد اور اصلاحی کام ہوا ہے اس کی ابتداء شاہ ولی اللہؒ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی اصلاحی سیاسی جد وجہد کی سلوٹوں میں نظر آتی ہے۔ اس میدان میں خود انھوں نے اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے اپنی پر اثر تقریروں سے اور اپنے مؤثر رسائل و کتب سے برصغیر کے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ پر اثر ڈالا جس کی گونج علمی و ادبی حلقوں میں آج تک سنائی دیتی ہے، انھیں کے قافلوں میں وہ علمائے دین اور ادباء شامل ہوئے جن میں سے بعض نے برطانوی استعمار کو اپنا ہدف بنایا اور بعض نے ملت اسلامی کے تھکے ہارے شکستہ دل وشکستہ ذہن افراد کو سنبھالنے کی کوشش کی، اس سلسلۂ زریں کی ممتاز ہستیوں کے تذکرے ان کے اثر پذیر ادب کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں، فکر اسلامی کے حامل عظیم شاعر سر محمد اقبال غیرت اسلامی کے حامل شعراء ظفر علی خان، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، اور علامہ شبلی نعمانی جن کی مؤثر نظموں اور اشعار نے جذبہ اسلام کو مہمیز کیا، برطانوی استعمار سے نبرد آزما ادباء وشعراء میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اسلامی قدروں کے علمبردار علماء وادباء میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور اسی سلسلہ حکایت نگاری سے کام لینے والے ادباء میں مولانا عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری، اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور بچوں کے ادب کے سلسلہ میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ یہ حضرات اور انہی جیسے متعدد دیگر حضرات برصغیر کی ادبی تاریخ میں نگینوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں اسلامی ذہن ودماغ کی حفاظت کا کام ان ادباء کے ذریعہ بہت شاندار طریقہ سے انجام پایا، اسی کے ساتھ ساتھ یہ حضرات ادب کے سنجیدہ معیار اور اس کے اساطین ادب میں شمار کئے جاتے ہیں۔

جنگ آزادی اور اصلاح عوام کے کام کے لئے جس طرح تحریری ادب نے ایک بڑی ذمہ داری پوری کی ہے، اسی طرح خطابی ادب نے بھی بڑا معرکہ سر کیا ہے، اس میدان میں بھی برصغیر نے بڑے آفتاب وماہتاب دیکھے ہیں، جن میں مولانا آزاد اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے خاص طور پر بڑی داد حاصل کی ہے۔

خطوط اور تاثراتی خاکے

خطوط ایک شخص دوسرے شخص کو عام طور پر اپنے کسی اندرونی تقاضے یا احساس کے نتیجہ میں لکھتا ہے، یہ تقاضہ یا احساس اس کی تحریروں میں جھلکتا ہے، بلکہ اس میں وہ اسی طرح شامل ہوتا ہے جیسے سمندر میں نمک یا شربت میں شکر، ان دونوں کو پینے سے وہ حقیقت محسوس ہو جاتی ہے جو اس پانی میں چھپی ہوتی ہے۔ یعنی نمکینی اور مٹھاس، اس نمکینی یا مٹھاس کو زبان بآسانی محسوس کر لیتی ہے۔

انسانی کام و دہن سے نکلنے والے الفاظ جس طرح اپنا صوتی تصور پیش کرتے ہیں اسی طرح لکھنے والے کے وجدان و شعور کی چھاپ بھی اپنے مخاطب کے وجدان و شعور پر مرتسم کرتے ہیں۔ یہی الفاظ خطوط کے دائروں میں اثر بھر دیتے ہیں۔ اسلئے بعض وقت بے تکلف لکھے جانے والے خطوط بھی رعنائیوں کے حامل بن جاتے ہیں۔ عربی کے ذخیروں میں ہوں یا فارسی و اُردو کے ذخیروں مین ہم کو خطوط کے ایسے مجموعے اور منفرد خطوط ملیں گے، جو طاقت و اثر کے بڑے حامل ہیں۔ اسی سے خطوط ادب کا دقیع جز بن جاتے ہیں، وہ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے خطوط ہوں، یا

غالب کے خطوط، یا حضرت مجدّد الف ثانی کے خطوط ہوں، یا مولانا ابوالکلام آزاد کے غبار خاطر کے خطوط، کیف واثر لئے ہوئے جگہ جگہ مل سکتے ہیں، یہ ایک اچھوتا مضمون ہے اور دلچسپ بھی۔

خطوط سے ملتے جلتے وہ مختصر حجم کے نظریات یا شذرات ہیں جو لگ بھگ خطوط ہی کے طرز لئے ہوئے ہیں اور اسی کی طرح اثر پذیر، ان کے ذخیروں میں بھی بعض بعض وقت دل کو ہلا دینے والے اور ذہن میں حرکت پیدا کرنے والے نمونے مل جاتے ہیں۔

خطوط ہوں یا تأثراتی خاکے ان کے دائرہ ہائے کار علاحدہ علاحدہ ہوں یا ملتے جلتے ادب کے میدان میں دیگر ادبی ٹکڑوں کے ساتھ کام کرتے نظر آتے ہیں۔

ان میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خطوط کو پڑھ کر خط کے لکھنے والے کا دل کتنا پڑھا جاسکتا ہے، اگر اس کو تھوڑا بھی پڑھا جاسکے تو یہ خط کے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی دلیل ہے، خط کی اثر پذیری بعض وقت اتنی ہوتی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے دل کا رخ بدل جاتا ہے، بعض وقت اس کے دل کی گرمی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، بعض وقت ٹھنڈا دل گرم ہوتا ہے، بعض وقت دل بیٹھ جاتا ہے۔

ہم کو حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پھر خلفائے راشدین وصحابۂ کرام کے یہاں بھی خطوط ملتے ہیں، اور ان کے بعد صلحاء وعلماء کے یہاں اور اسی طرح ادباء اور عام پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

اردو ادب میں غالب کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے، گذشتہ دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ''غبار خاطر'' کے مجموعہ نے اردو ادب میں

ایک خاصا مقام حاصل کیا۔

اور ابھی قریبی زمانہ میں خطوط کے کئی مجموعوں نے بہت خراج تحسین حاصل کیا۔

خطوط رنگ اور ذوق کے لحاظ سے بھی بڑے متنوع ہوتے ہیں۔ بعض میں ثقافتی پہلو غالب ہوتا ہے، بعض میں عام انسانی پہلو، بعض میں ادبی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے، بعض میں اخلاقی، ان خطوط کے رنگ وذوق کے اس تنوع میں ان کے لکھنے والوں کی زبان کے انداز ومزاج اور ان کی ثقافت وعلم کا دخل ہے۔

بچوں کا ادب

اگر مخاطب کی سمجھ اور ذوق کی رعایت رکھتے ہوئے دل پذیر اسلوب میں بات کرنے اور اس کے قلب و دماغ کو متوجہ کرنے والے انداز تعبیر اختیار کرنے کو ادب کا نام دیں تو بچوں سے ان کی صلاحیت فہم و ذوق اور ان کو متوجہ کرنے والے اسلوب میں پیش کرنا ان کا ادب قرار پائے گا، اور اس طرح بچوں کا ادب نوخیز نسل کی تربیت اور ذہن سازی کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوگا، اور خاص طور پر آج سے پچاس سال قبل کا زمانہ سامنے رکھا جائے جب کہ ذرائع ابلاغ کے نئے وسائل عام نہیں ہوئے تھے، تو بچوں کا ادب بچوں کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ان کی ذہن سازی بھی کرتا تھا اور کر سکتا تھا۔ بچوں کا یہ ادب تحریر و گفتگو دونوں ذریعہ سے وجود میں آتا اور کام کرتا رہا ہے، گفتگو والا حصہ عموماً محفوظ نہیں کیا جا سکا لیکن تحریری ادب مختلف نمونوں کی صورت میں خاصہ محفوظ ہے، مولانا اسماعیل میرٹھی نے اردو زبان کی ریڈریں لکھیں، ڈپٹی نذیر احمد نے "توبۃ النصوح"، "مرآۃ العروس" اور "بنات النعش" جیسے ناول لکھے، اقبال نے بڑوں کے لئے شاعری کے ساتھ بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھیں، "مجموعہ نظم حالی" میں

اکثریت بچوں ہی سے متعلق نظموں کی ہے، اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی بچوں کے ذہن وخیال کی تربیت کے لئے کہانیاں لکھیں، اور بتدریج یہ کام بڑھا، اور کئی کئی ماہنامے بچوں کی زبان وادب میں نکلنے لگے، ''غنچہ'' اور ''پیام تعلیم'' پرچوں نے دیگر پرچوں کے لئے راہ ہموار کی، اور ابھی ماضی قریب میں کئی مفید پرچے نکلنے لگے، مثلاً رامپور کا ''ذکریٰ''، اور بجنور کا ''اچھا ساتھی''، اور مختلف مکاتب فکر سے بچوں کے رسالے نکلنے لگے، اور آج بھی کئی پرانے اور کئی نئے پرچے نکل رہے ہیں۔

بچوں کے ادب کو ہم بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں، ایک تو تعلیمی ادب جس میں حسن بیان اور سہل اسلوب کو تعلیمی مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، دوسرا تفریحی ادب جس میں کہانیوں، قصوں اور نظموں کے ذریعہ بچوں کے لئے ثقافتی تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے، تیسرا تربیتی اصلاحی ادب جس میں ادبی پیمانوں کا لحاظ کرتے ہوئے اخلاق وتربیت کے تقاضے سے مضمون بیان کیا گیا ہو۔ اول الذکر قسم بچوں کا ادب ان کی مختلف فنون کی درسی کتابوں میں ملتا ہے جس کے ذریعہ ان کتابوں کو پڑھنا اور محفوظ کرنا بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ قسم تعلیمی مقصد پورا کرتی ہے، یہ نوخیز بچوں کے تعلیمی نصاب کو ان کے لئے آسان اور زیادہ لائق استفادہ بنانے کا کام انجام دیتی ہے، اور جدید تعلیمی نظریات کی رو سے یہ ضروری ہے، ورنہ بچے کا ذہن نہ صرف یہ کہ درسی عبارتوں سے الجھتا ہے بلکہ بعض وقت اس کے تعلیم ہی چھوڑ دینے کا باعث بن جاتا ہے، بچوں کے دماغ میں ایک بات اتارنا ہو تو اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں پوری طرح کھلی ہوں، وہ باہر کی ہوا لے سکتا ہو، ورنہ بات

پوری طرح اس کے دماغ میں جاگزیں نہ ہوگی، جو کہ ذرا مشکل اور بعض وقت کڑوی بھی ہوتی ہے۔

بچوں کے ادب کی دوسری قسم بچوں کے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ اور لطف کی ہوتی ہے، اس کے لئے کسی ترغیب کی ضرورت نہیں ہوتی، بچے ذرا بھی واقف ہونے پر اس کی طرف لپکتے ہیں، اور اس کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس میں مستغرق ہو جاتے ہیں، اور اس ادب میں اگر محیر العقول واقعات اور کہانیاں پیش کی جائیں تو اور بھی ان کے لئے پسندیدہ بات ہوتی ہے، لیکن مصنفین کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو بچوں کے فائدے اور تربیت کے دائرہ میں رکھیں، ان کے دماغ کے بے سود اور بے حقیقت باتوں میں مشغول ہو جانے کا ذریعہ نہ بنیں، کیونکہ وہ وقت جو ایسے ادب کے مطالعہ میں گذاریں گے اس کا کوئی ثمرہ ان کو حاصل نہ ہو سکے گا، بچوں کے ادب کی یہ قسم بہت مؤثر اور ذہن سازی کا بڑا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس ادب کو با مقصد ادب میں بآسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس کے مواد کی ترتیب اور انتخاب ایسا کیا جائے کہ وہ تربیتی ادب بن جائے، اور یہ رجحان اب جگہ جگہ اپنایا جا رہا ہے، جن میں علی العموم وطنی مقاصد، نظریاتی مقاصد اور مذہبی مقاصد کو پیش نظر رکھا جا رہا ہے، یہ مفید اور تعمیری رجحان ہے لیکن اس میں بعض بعض وقت گروہی عصبیت کا رنگ اختیار کیا جاتا ہے جو کہ مضر ہوتا ہے، مفید اور تعمیری رجحانات اختیار کرنے میں یہ کوشش ہونا چاہئے کہ تخریبی عمل سے بچا جائے، ضرورت ہے کہ صرف مثبت اور غیر اختلافی رجحان ہی کو اپنایا جائے تا کہ کم عمر کے بچوں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا جا سکے۔

عہد سابق میں تعلیمی میدان میں ادبی طریقہ کا لحاظ عام طور پر ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا اور نصاب کی کتابیں مشکل اور حل طلب عبارتوں میں ہوتی تھیں، لیکن تعلیم کے موضوع پر جو تحقیق و تحسین کی کوششیں ہوئیں ان کے نتیجہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ درسی نصاب کی عبارتوں میں تسہیل بلکہ بچہ کے ذہن کے لحاظ سے کشش کا سامان ہو، اس میں اردو کے دائرہ میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا کام متعدد خوبیوں کا حامل ہے، عربی میں مصر کی ''القرأۃ الراشدۃ'' اور اس جیسی دوسری کتابیں بھی اسی دائرہ میں شمار کی جاسکتی ہیں، یہ دراصل زبان سکھانے کی کتابیں ہیں، لیکن ان میں سہل اور دل پسند و ترغیب کے اسلوب میں تاریخ اور ثقافت عامہ کی کتابیں بھی تیار کی گئیں۔

رہا بچوں کا تفریحی ادب تو اس میں گذشتہ مدت میں خاصا کام ہوا ہے، کہانیوں اور دلچسپ واقعات پر بہت چھوٹی چھوٹی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اور شائع ہوئیں، جن کو بچوں نے بہت شوق و ذوق سے پڑھا، اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے، عربی میں بھی اس سلسلہ میں خاصا لٹریچر تیار ہوا، اس میں کامل کیلانی کی کتابیں سرفہرست ہیں، لیکن اس سلسلہ کا سارا لٹریچر صرف ثقافت و تہذیب کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے، اس میں تربیتی مقصد شامل کر دیا جائے تو یہ تربیتی لحاظ سے بہت مفید ہے۔

بچوں کے ادب کی تیسری قسم اخلاقی و تربیتی ہے، اس میں تاریخی واقعات اور خود نوشت قصوں اور کہانیوں سے بچوں کی تشکیل ذہنی اور اخلاقی تربیت کا کام لیا جاتا ہے۔

یہ ادب بامقصد ادب ہے جو بچوں کے ذہن کی تشکیل انسانی

قدروں اور صالح تصورات کی بنیاد پر کرتا ہے، لیکن اس میں متوازن اور دل پسند ڈھنگ اختیار کرنا آسان کام نہیں، اس کو ادب کے ہنر مند لوگ ہی نباہ سکتے ہیں، وعظ کہنا بھی آسان ہے، اور ادب کا اناپ شناپ مضمون اور بے لگام انداز بیان کے ساتھ تیار کرنا بھی آسان ہے۔ مشکل کام ہے توازن اور تناسب۔ اسی لئے اس ادب کو پیش کرنے میں سب اہل قلم کامیاب نہیں ہوتے، لیکن یہ بامقصد ادب انسان کی صلاحیت کے دائرہ سے باہر نہیں ہے، ہم کو یہ بامقصد ادب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں اور انہی جیسے متعدد اہل قلم کے یہاں نظر آتا ہے، جنھوں نے اپنی تحریر سے بچوں کو وطنی لگاؤ اور انسانیت کی قدروں سے شناسا کرنے کی کوشش کی، پھر ان کی کوششوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس ادب کا رجحان ہوا، اور کام انجام پایا، اس ادب کے پیش کرنے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور جماعت اسلامی کی انجمن تعمیر ادب کے ادیبوں کا بھی خصوصی حصہ رہا، ندوہ کے حلقہ کے افراد کا بھی اچھا حصہ رہا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس کا شوق ہوا، اور انہوں نے اپنی کم عمری میں ہی اس سے دلچسپی رکھی، پھر عربی زبان پڑھنے پر عربی ادب کا مطالعہ کیا اور اس میں امتیازی خصوصیت حاصل کی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث کا جو علم حاصل کیا اس سے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اسلام کی ادبی تاریخ میں قرآن وحدیث کے اثر سے ادب کے میدان میں جو ستھرا اور انسانیت نواز مزاج پیدا ہوا تھا اور جس کے نتیجہ میں اس مزاج کے بہت سے نمونے اس کی ادبی تاریخ میں مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان کو نکالنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ

نے خود اس پر کام کیا اور اسی کے ساتھ خود بھی اس مزاج کا ادب تیار کیا اور پھر اس کو ایک تحریک بنا دیا، اس سلسلہ میں ان کا تقریباً یہ پہلا کام تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ مشرقی ممالک غلامی کے اثرات سے اپنے فکر اور ادب کو نکال نہ سکے تھے، مولاناؒ کی اس دعوت کو عربوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس سلسلہ میں مولاناؒ کی پیش قدمی کو سراہا اور مولانا کی تائید کی، آج ہم اس کے ثمرہ کے طور پر رابطہ ادب اسلامی کو دیکھ رہے ہیں، مولاناؒ نے ادب کے اسلامی تصور کے مطابق بچوں کے لئے بھی عربی سلسلہ تیار کیا اور اس کو بھی عربی کے ادیبوں نے بہت سراہا۔

یہ وہ دور تھا کہ بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابوں میں مغرب کے آزادانہ طرز عمل نے جانوروں اور غیر انسانی مخلوقات کے تذکرہ کو بھی بچوں کی پسند اور رغبت کا موضوع بنا دیا تھا اور اس کا چلن قائم کر دیا تھا، مولاناؒ نے اس کو غیر مفید بلکہ مضر قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ محض تفریحی اور بے بنیاد واقعات کے بجائے اخلاقی و تربیتی حکایات اور واقعات ہوں تو بچوں کی ذوقی و ذہنی و نشوونما کے لئے مفید ہوگا، اس سلسلہ میں حکایاتی ادب کی اہمیت کو مولانا نے واضح کیا اور تحریر کیا کہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے بھی حکایاتی ادب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: ”فاقصص القصص لعلهم يتفكرون “ سورہ یوسف میں ہے: ”نحن نقص عليك أحسن القصص “ اور مولاناؒ نے تحریر فرمایا کہ اسلامی تاریخ و ادب میں اس سلسلہ کا مواد سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، مولاناؒ نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور بچوں کے لئے بھی پسندیدہ اور مؤثر صالح مواد پیدا کر دیا، عربی میں مولاناؒ کا اس سلسلہ کا کام بڑا ممتاز رہا، ”قصص النبيين

للأطفال" پہلا تا پانچواں حصہ، "قصص من التاریخ الاسلامی" وغیرہ ان کی تصانیف بہت مقبول ہوئیں۔ اور بچوں کے ادب کی تعلیمی قسم میں بھی مولاناؒ کا بڑا حصہ ہے، اس میں ان کی "القرأۃ الراشدۃ" اس سلسلہ کی نہایت کامیاب کوشش ثابت ہوئی ہے۔ مصر وشام وحجاز کے بہت سے اسلام پسند ادیبوں کا بھی اس سلسلہ میں نمایاں کام ہے، خاص طور پر عبد الرحمٰن رأفت پاشا کے کئی سلسلے اس سلسلہ میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے مولاناؒ کی اسی سلسلہ کی سبقت کو انھیں کے ادبی سوچ کے طریقہ پر چلنے والا قرار دیا۔

اسلامی بیداری میں علامہ شبلی نعمانیؒ کا حصہ

''الفاروق'' کے تناظر میں

علامہ شبلی نعمانیؒ برصغیر ہندوپاک کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی اہم ترین خصوصیات میں ملت اسلامیہ کی موجودہ پسماندگی سے بے چینی، ملت کے شاندار ماضی کی یاد اور اس کی بحالی کے لئے کچھ نہ کچھ کر ڈالنے کا جذبہ اور زمانہ کے قدیم وجدید کے درمیان ایک متوازن ربط پیدا کرنے کی خواہش موجزن تھی، جس کو انھوں نے اپنے مؤثر اور بلیغ شعر ونثر میں ظاہر کیا ہے۔

ان کی ساری تصانیف اور ساری منظومات اس کی آئینہ دار ہیں کہ وہ ایک طرف علم وہنر کے میدان میں یورپ کی ترقی اور طاقت وسیاست میں اس کی برتری کو اس کی پوری آن بان کی حالت میں دیکھ رہے تھے، اور دوسری طرف وہ مشرق کی تمدنی بے بضاعتی اور علمی کم مائگی اور سیاست وطاقت میں پسماندگی کو دیکھ رہے تھے، پھر اس پر مستزاد یورپین اہل علم کی ان علمی کاوشوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بگاڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے تھیں، ان حالات کے صحیح

احساس وشعور نے علامہ کو ایک طرف مسلمانوں کو چشم بصیرت وا کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے لئے انھوں نے اپنی ادبی وعلمی صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کیا، اور یہی احساس وشعور تھا جس نے ان کو علی گڑھ سے نکل کر ندوہ کی تحریک کو اپنا نصب العین بنا لینے اور اس کے لئے اپنے وقت کو صرف کرنے پر لگا دیا، تاکہ مسلمانوں کے لئے جامع تعلیم کی ایک ایسی صورت بن سکے جس سے مسلمانوں کے ماضی کے اعلیٰ سرمایہ علمی کے ساتھ جدید علمی ترقی کی صلاحیت کے آدمی تیار ہو سکیں۔

علامہ شبلی نے مسلمانوں کے جامع تعلیمی منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے جس فکرمندی اور عملی کاوش سے کام لیا اس نے اس میدان کار میں خاصا اثر پیدا کیا، اور فائدہ پہونچایا، اور اس راہ میں ان کے متعدد غیر معمولی صلاحیت کے شاگرد تیار ہوئے جنھوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور کام انجام دیا۔

دوسری طرف علامہ نے اپنی تصنیفات اور منظومات سے علم قدیم وعلم جدید کے حلقوں کو بھی قیمتی سرمایہ مہیا کیا، خاص طور پر تاریخ کے راستہ سے انھوں نے مسلمانوں کے ماضی کی سربلندی اور ان علوم میں ان کی جدت ومہارت کا تعارف کرایا، اور اس طریقہ سے مسلمانوں میں مغرب کی ترقی وتفوق کو دیکھ دیکھ کر جو احساس کمتری اور پست ہمتی پیدا ہو رہی تھی اس کا خاصہ ازالہ کیا۔ انھوں نے مغربی مصنفین کی تحریروں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں تھیں، یا کی جا رہی تھیں ان کا عالمانہ طریقہ سے ابطال کیا، کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی علم دوستی کو جو مجروح کیا گیا تھا اس کی حقیقت واشگاف کی،

ان باتوں کا یہ غیر معمولی اثر پڑا کہ کالج میں پڑھنے والے مسلم طلباء کے پژمردہ دلوں میں جان پڑ گئی، اور وہ مولانا کے مضمون کے حوالہ سے فخر کرتے کہ اسلام اور مسلمانوں پر مغربی مستشرقین کا الزام جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹ اس علمی تحقیق سے ثابت ہے۔

علامہ مرحوم نے المامون لکھ کر مسلمانوں کی سیاسی وتمدنی وعلمی عظمت وترقی کو نمایاں کیا اور الفاروق لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اپنے شاندار ماضی پر فخر کرنے اور حوصلہ مندی کے جذبات پیدا کرنے کا کام لیا۔ علامہ کے عظیم شاگرد مولانا سید سلیمان ندویؒ حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مؤرخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوؤں پر عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی تشہیر کی کہ خود مسلمانو ں کو بھی اس کا یقین آ گیا، اور پھر ہندوؤں میں جادوناتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے، جنھوں عالمگیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا شبلی ہی کا قلم تھا جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیئے۔ اب تک اس باب میں ان کتاب کی ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے علمی وتمدنی کارناموں کو پوری آب وتاب سے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے جمع کیا، اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہانگیری وغیرہ، اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے، اور ایک حد تک سچ بھی ہے، یہ سلاطین مسلمان

ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام تر نمائندے نہ تھے، اس لئے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔"

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تلاش ومحنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضاء کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انھوں نے دنیا کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس مرقع میں ہے تو پیش کرے۔

آج کل کی سیاسی واقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی واقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ ان کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے؟ الفاروق سے! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان کی دور بیں نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کرلیا تھا۔

الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمد للہ پوری طرح موجود ہی ہے۔ مصنف نے اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی، چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے

کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کا بیج بو دیا، اسی طرح اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے۔ العصمۃ للہ وحدہ

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو معیار یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس وسعت نظر، جستجو اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا جن کی مدح وستائش کا اعتراف خود یورپ کے مستشرقین نے علی الاعلان کیا، اور اس طرح اسلام کی بلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست وبازو نے اس کو علی حالہ بلند رکھا اور اس کے لئے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن حکیم کو محرف ثابت کرسکیں، اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدلیس اور وسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انھوں نے وفات پائی اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک پرانا نسخہ پایا ہے جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی، چنانچہ ۲۵/اپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹیکل لکھا اور بڑے دعویٰ سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لئے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا، اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا سارا تار وپود بکھیر دیا۔

اس زمانہ میں علماء جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڑھ آنے سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے، صرف ایک رسالہ ''قرأۃ فاتحہ خلف الامام'' کے رد میں اردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علماء کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کردیں، اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی وحضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور اس زبان کو جس کی نسبت بطور معذرت سیرۃ النعمان میں یوں فرماتے ہیں۔

''حرف بہ اردو زدن آئیں نہ بود''

اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علمائے زمانہ کے لئے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا اور بے شمار کتابیں ان کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ اس میں بعض علماء اسلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایات وافادیت اور مضامین کی بلندی وندرت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، مگر بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت، علمی وفنی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرز بیان کے تتبع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لئے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ واستعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ ان کی کتابیں ادب وانشاء کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں، اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ، حضرات علماء کو بھی

بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی و مذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے۔

اس موضوع پر ایک اور رخ سے نظر کیجئے، اس وقت حضرات علماء جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے، تصوف وفقہ کے اخلاقی مسائل کی تحقیق یا فرق باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا، اس محدود دقبہ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، تاریخی فقہی، تمدنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوع سخن میں وہ گلباری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پر بہار ہوگئی، اور اب اس کی تقلید میں علماء کی تحریریں اور تالیفیں بحمد للہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں۔

اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علماء کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا، اور اس وقت علم کلام کا گویا یہی طرز سخنوری تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیف کے لئے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گذر گئی اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے حنفی اور اہل حدیث، سنی اور شیعہ مسلمان اور عیسائی مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی تالیفات پر نظر ڈالئے بقول انہی کے ؎

گرچہ سرد برگ سخن دیگرست
شمع ہمان ست ولگن دیگرست

انھوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاق حق اور ازہاق

باطل کے لئے زمانہ کے مطابق ایک اور دلنشیں شکل پیدا کردی، ان کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہل حدیث کا مناظرہ نہیں؟ ان کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ سنی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی وتاریخی کتابیں کیا عیسائی مشنریوں اور مستشرقین اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل وقال کا طریق، حریفانہ تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن، سوء تعبیر اور ناسزا سب وشتم سے اتنا بدنما ہوگیا تھا کہ اس نے تاثیر وتاثر اور قبول حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر سے کھودی تھی، حالانکہ احقاق حق اور ازہاقِ باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے، اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لئے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں، بلکہ جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ردِّ الزام اور ردِّ جواب کے بجائے اپنے ہی دعوؤں کو ایسے دلنشیں، دلچسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت، طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت حریف کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے۔ چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جواب میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں، اور ان سے بڑا فیض پہنچا اور علماء نے بھی اس انداز پر کتابیں لکھنی شروع کردیں، جو مفید حال ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے عہد میں جو متعدد مشکلات، شکوک و شبہات، پست ہمتی اور اعتراضات کا عہد تھا، انگریزوں کی سخت گیر اور معاندانہ نگرانی وحکومت تھی، اور مسلمانوں کی شکست خوردگی اور بدحالی تھی،

بڑی ہمت سے کام لیا اور ایسا بلند تخیل اپنایا اور اس کے لئے اپنی ذہنی اور علمی توانائیاں صرف کیں جو صرف دور رس ہی نہ تھیں بلکہ نتیجہ خیز تھیں، آج ندوۃ العلماء کے تعلیمی تخیل اور نظام میں، دارالمصنفین کے تیار کردہ اہم تاریخی اور کلامی سرمایہ علمی میں اور ان تصنیفات میں جو خود علامہ نے تیار کیں، اور ان کے عظیم شاگردوں نے اسی نہج پر تیار کیں، علامہ کے تخیل کے عمل دخل کو دیکھا جاسکتا ہے، وہ بلاشبہ برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ایک بڑے کارپرداز اور قائد تھے، جن کے ذریعہ اسی عہد سے اسلامی بیداری کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوئے۔

اقبال کا مردِ مومن

شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال علیہ الرحمتہ اپنے معاصرین میں چوٹی کے شاعر شمار کئے جاتے ہیں، وہ فکر و خیال اور فلسفہ و فن کے اندر بلند مقام پر فائز ہیں، دنیا میں مردِ مومن کے مقام و مرتبہ اور انسانی زندگی کے سلسلہ میں ان کی آراء پختہ اور نظر بڑی گہری ہے۔ ان کے کلام میں ایسی قوت اور اثر انگیزی ہے کہ ہر پڑھنے اور سننے والے کے دل میں اتر جاتا ہے، امت مسلمہ اور عالم اسلام کے سلسلہ میں ان کے افکار و تخیلات بڑے قیمتی اور عظیم الشان اہمیت کے حامل ہیں، بلند و وسیع فکر، بلا کی ذہانت اور مطالعہ کی گہرائی ان کی زندگی کے عناصر تھے، جسے انہوں نے مشرق و مغرب کے مختلف حلقوں اور معاشرہ میں رہ کر گزاری تھی اور قدیم و جدید فلسفہ و تمدن اور مختلف اقوام و ملل کے رجحانات پر ریسرچ کیا تھا۔

اقبالؒ نے پسماندہ اور پچھڑی ہوئی امتوں کے زوال و ادبار کو دیکھا، ان میں وہ قوم بھی تھی جس کی عہد رفتہ میں تاباں و درخشاں تاریخ تھی اور جس کا ستارہ عزت و شرف بام عروج پر تھا۔

ڈاکٹر اقبال نے زمین اور اس کی پستیوں پر نگاہ ڈالی، انہوں نے آفاق

میں گم ہو کر مرد مومن کے مقام کی تلاش و جستجو کی بالآخر انھیں نظر آیا کہ مرد مومن کا مقام اس وسیع کائنات میں بہت بلند و بالا ہے، اس زمین کی پستیوں میں اس کا مقام نہیں ہے، اقبال کے نزدیک مرد مومن کو رنگ و نسل اور قوم و وطن کی حدود میں بند نہیں کیا جا سکتا ان کی نظر میں ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ آفاق اس میں گم ہو اور وہ زمان و مکان کی حدود سے متجاوز ہو۔

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک غیور مومن کی بلند ہمتی ان چند کلیوں پر راضی نہیں ہوگی، اسی لئے وہ مرد مومن سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

کبھی وہ اس کو عقاب سے تشبیہ دیتے ہیں تو کبھی شاہین سے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ اسے پسند نہیں کرتے کہ مرد مومن کی جولانگاہ انہیں میدانوں میں سمٹ کر رہ جائے جن میں آج کا انسان محدود ہے، وہ ہر دم اسے پر دم اور بیدار ہمت دیکھنا چاہتے ہیں ان کی نگاہ متجسس میں مومن وہ ہے جو ہر میدان میں پیش پیش اور ہر دم رواں پیہم دواں ہو۔

علامہ کو اس بات پر بے حد افسوس ہے کہ آج مرد مومن پستی کی اس حد کو جا لیا ہے جو کبھی بھی اس کے شایاں نہیں تھی، کیونکہ مرد مومن زندہ جاوید ہے، وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیغام رکھتا ہے، اس کے سینہ میں ایک زندہ جاوید امانت ہے اور اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے بسر ہوتی ہے۔ خالق کائنات نے اس کا انتخاب اپنے پیغام کے لئے کیا ہے، دنیا میں بسنے والے

تمام انسانوں کے واسطے یہ پیغام ایک ہمہ گیر ہدایت، اخلاقی تربیت اور امت کی قیادت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ خدا نے مردِ مومن کو انسانیت کا امام اور اس روئے زمین کا خلیفہ مقرر کیا ہے وہ اہل زمین کے لئے رافت و رحمت کا اور امن و سلامتی کا معلم ہے اور ان کو اصل خطرے سے آگاہ کرنے والا ہے جس میں بیک وقت دنیا اور انسانیت دونوں کی ہلاکت و فلاکت ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ مومن دنیا کی امامت اور امت کی قیادت و سیادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے عالم کی قیادت ہی زیبا ہے اور ساری مخلوق اس کی تابع فرماں ہے، مسلمان اس سلسلے میں اپنے پروردگار کے حکم کا تابع و مطیع ہے وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتا وہ ہمیشہ حق و بھلائی کی راہ پر گامزن رہتا ہے اور وہ وہی کام کرتا ہے جس سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہو۔

کافر تو حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا شیوہ و شعار سمجھتا ہے، لیکن جب مومن خدا کے پیغام کو لے کر کھڑا ہوتا ہے اور ایمان و یقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت قدرت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

مومن کے وجود سے کائنات کا وجود ہے ایک مومن پوری کائنات پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ لالہ وگل کی سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا وہ صدق وصفا کا علمبردار ہوتا ہے، اسے مال ودولت اور جاہ ومنصب اپنے دام فریب میں گرفتار نہیں کر سکتے، اسے اس پرفریب دنیا کے اسباب آرائش وزیبائش اپنی طرف موہ نہیں سکتے، ایک مردمومن کو اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے کوئی چیز غافل نہیں کر سکتی، وطنیت وقومیت اور نسل پابہ زنجیر نہیں کر سکتے۔

اقبالؒ پورے یقین واطمینان کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان ایک خاندان ہیں وہ ایک ہی مقصد کی خاطر پیدا کئے گئے ہیں اور انسان کے مقام خلافت سے واقف کرنے کے لئے انہیں وجود بخشا گیا ہے، وہ نیک اصولوں کی راہ میں ہردم کوشاں رہتے ہیں، وہ ایک طاقت اور ایک دل ہیں، ان کی مثال ایک جسم کی ہے اگر اس کے کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا بدن کراہتا ہے، اقبالؒ کی نگاہ میں مردمومن سراپا عمل، چاق وچوبند صبر وشکیبائی کا پتلا، کشادہ قلبی اور پریم ومحبت کا دریا اور سرتاپا حرکت وقوت ہوتا ہے، ساری فضا اس کی کارگاہ عمل ہے، نیل وفرات اس کے بحر کی موجیں ہیں اور دنیا اس کی قیادت کے زیر سایہ ہے۔

ڈاکٹر اقبالؒ اس شوق وامید میں بیتاب رہتے ہیں کہ مسلمان اپنی آرزوؤں کو برلائیں وہ اس بھیانک خلا کو پر کریں جو عملی میدان میں پیدا ہو گیا ہے وہ اپنے کلام میں مسلمانوں کو عظیم پیغام انسانی کے لئے پکارتے ہیں، اور انہیں یورپ کی مادیت سے ڈراتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''میں نے یورپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی گہرائیوں میں گھس کر اس کا جائزہ لیا ہے، لیکن میں نے اس کے اندر گوہر نایاب اور گوہر آبدار نہیں پایا، لہٰذا تم اس سے بچو

اور اس کی راہ پر مت چلو، آج نہیں تو کل اس کا زوال یقینی ہے تم خوش اخلاق امت بنو اور اپنے اسلاف کے نقوش پا کی اتباع کرو، تم عمدہ اصولوں، پاکیزہ مقاصد اور بلند حوصلہ والی امت بنو۔

علامہ اقبال ایک مسلمان کو اس نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی کے مطابق اس سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے اشعار سراپا اشک رواں، امنڈتے ہوئے جذبات اور روشن وزندہ فکر معلوم ہوتے ہیں، انہیں افکار سے ان کا دیوان آراستہ ومزین ہے اور یہی ایک مرد مومن کی زاد راہ اور اس کی روحانی غذا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی یہ گونجتی ہوئی پکار اور پیہم صدا ایک ایسے بلند اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لئے ہے جسے صدیوں سے امت مسلمہ کی ہوا پرستی ودنیاداری نے بکھیر رکھا ہے، اقبالؒ کی نظر میں آج دنیا اسلامی قیادت کی سب سے زیادہ محتاج ہے اور اسی سے اس کو امن وسکون کی دولت نصیب ہوسکتی ہے، دنیا اس وقت روح کی متلاشی ہے، مادیت نے اس کی روح کو بگاڑ دیا ہے۔

روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

مسلمان جو علمبردار پیغام الٰہی ہے، اس نے اپنا منصب چھوڑ دیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پوری انسانیت شتر بے مہار ہوگئی۔

اردو سے ہندوستانی مسلمانوں کا

ثقافتی وادبی رشتہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق اردو زبان و ادب کی بقاء تا حال فکر کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کو تقسیم ہند کے موقع پر یا عوامی زبان کی حیثیت حاصل کرنے کے سلسلہ میں ترجیح یا رعایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکا۔ کسی بھی زبان کے فروغ اور عوامی مقبولیت کے لئے اہل اقتدار کی طرف سے فراخ دلی اور رعایت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اردو کو یہ بات حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے حصول کے لئے اردو والوں نے مسلسل جدوجہد کی لیکن اس جدوجہد کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا، وقت گزرتا گیا اور اس ملک میں اردو کی وسعت اور رسوخ میں کمی آتی چلی گئی حتی کہ اس کا دائرہ عمل اب مدارس اسلامیہ اور اردو ادب سے تعلق رکھنے والے مخصوص حلقوں تک ہی محدود ہوکر رہ گیا ہے اس کے نتیجہ میں مسلمان گھرانوں کے اکثر نوجوان افراد اردو بول تو لیتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے اور ان کی ایک تعداد پڑھ بھی نہیں سکتی۔

جہاں تک اسلامی اور دینی مدارس کا تعلق ہے وہاں عموماً ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے نیز وہاں عربی زبان کے تعلیم و تعلم کے اثر سے اردو

کو برابر غذا مل رہی ہے اور تقویت بھی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ مدارس ہزاروں کی تعداد میں پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر شہر اور قصبہ میں ان سے وابستہ حضرات ملتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اردو اس ملک میں مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی زبان بنی ہوئی ہے اور ملت کے عمومی مفاد کی بات کو بڑی حد تک ملت کے زیادہ طبقات میں پہونچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اور جہاں تک اردو ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تعلق ہے تو ان کو کسی حد تک حکومت کی ہمدردی ملتی رہتی ہے یہ ہمدردی اردو اکیڈمیوں اور ہندوستان کی تسلیم شدہ زبانوں کی کمیٹیوں اور اقلیتوں کی ہمدردی کے اداروں کے توسط سے حاصل ہوتی ہے، نیز اکثر یونیورسٹیوں میں اردو دوستوں کی موجودگی بھی اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے، لیکن اردو کی ان سرکاری اور نیم سرکاری ذرائع سے زیادہ رواج پانے اور وسعت حاصل کرنے کا فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ اردو ادب کو اس سے تقویت اور اردو ادب سے وابستگان کی کسی قدر حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

اردو کی ترویج میں مسلمانوں کے سماجی کارکن بھی کسی حد تک حصہ لیتے ہیں، اردو کو اس عمل سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ یہ کارکن اگر اپنی توجہ زیادہ بڑھائیں اور تعلیمی سلسلہ کے ذریعہ تقویت کی راہیں اختیار کریں تو اردو کی کمی کو کم کر سکتے ہیں، خاص طور پر پرائمری سطح کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا اگر ایک جال بچھا دیا جائے تو اردو بنیادی طور پر نئی نسل کی دسترس میں آجائے گی جس کو اس کے افراد اپنے ذاتی ذرائع سے اور توسیعی مطالعہ سے بآسانی مضبوط کر سکتے ہیں اور ترقی دے سکتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو کا مسئلہ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہاں مسلمان ایسی سیکولر حکومت کے تحت ہیں جس کے تحت آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور جو زبان اس ملک کی قومی زبان قرار دی گئی ہے وہ اس کی غیر مسلم اکثریت کی زبان ہے اور اس زبان میں اس کا کلچر اور مذہب سرایت کئے ہوئے ہے اور زبان اپنے الفاظ وطریقہ ادا میں علی العموم اردو سے قریب ترین ہے۔ اور اردو کا بدل بن سکتی ہے لیکن اس کا یہ بدل بننا صرف الفاظ کی حد تک ہوگا۔ زبان کے اندر جو ثقافتی، نفسیاتی اور مذہبی پہلو ہوتے ہیں ان کے لحاظ سے وہ بالکل بدل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ غیر مسلم روح ومزاج کے حامل ہیں اور اردو میں مسلمانوں کی ثقافت نفسیاتی مزاج اور مذہبی ورثہ کا کئی صدیوں کا سرمایہ ہے جس سے مسلمانوں کا دستبردار ہو جانا اپنی مسلم خصوصیت سے عاری ہو جانا ہے اور ہندی کو اردو کا بدل بنا لینے کی صورت میں ان کا اپنے ثقافتی اثرات کی جگہ پر ہر اس نئی اختیار کردہ زبان کے ثقافتی اثرات کو اختیار کر لینا ہوگا۔

اور یہ ایک خطرہ کی بات ہے اس کا تدارک اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمان اپنے ثقافتی ملی سرمایہ کو ہندی میں زیادہ سے زیادہ منتقل کریں کیوں کہ ان کو بہر حال اس سے واسطہ ہے لیکن اپنی دیرینہ زبان اردو سے جو ان میں کئی صدیوں سے رچی بسی رہی ہے اور وہ اس میں رچے بسے ہیں ان کا دستبردار ہونا ان کے لئے عظیم خسارہ کا باعث ہوگا اور اردو کی حفاظت ان کے لئے اتنی مشکل نہیں ہے جتنی کسی دوسری زبان کی کیونکہ فی الحال اپنی زبان کے صرف رسم الخط سے نئی نسل کو مربوط کر دینے سے اس کی حفاظت کا بنیادی مرحلہ انجام پا جاتا ہے جس کے بعد کے مراحل زیادہ مشکل نہیں رہتے۔

اردو زبان مسلمانوں کی ثقافت کا عظیم سرمایہ ہے، اس ثقافت میں اپنے اگلوں کے حالات رجحانات، خصوصیات اور اقدار سب کچھ ہے اور ان سے نئی نسل کا رابطہ ہرگز ٹوٹنا نہ چاہیئے۔

اسلاف کے حالات عموماً ان کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں اور یہ سوانح عمریاں خاصی تعداد میں اور تنوع کے ساتھ اردو میں موجود ہیں اور ان میں مضامین اور موضوعات کا تنوع بھی ہے۔ ان سوانح عمریوں کو باقی رکھنا اور نئی نسلوں کو ان سے واقف کرانا بھی ایک اہم فریضہ ہے۔

اُردو زبان سے بے توجہی
ملک وملت کا بڑا نقصان

اسلامی کے لفظ کے ساتھ جہاں ایک مسلمان کے دل ودماغ میں ایک اچھا اور انسانیت دوست اور انسانیت نواز تصور ابھرتا ہے وہیں مسلم دشمن اور اسلام سے بدگمانی رکھنے والے کے ذہن میں ایک غیر انسانی تصور ابھرتا ہے، جس کی اصل وجہ اسلام سے صحیح واقفیت نہ رکھنے والوں سے اسلام کا صحیح تعارف نہ کرا سکنا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین پیش آنے والے اقتصادی اور سیاسی معاملات میں وقتاً فوقتاً ہونے والی کشمکش باعث بنتی ہے، انسان کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ گہرائی میں جانے کی عموماً ضرورت محسوس نہیں کرتا صرف ظاہری معاملات اور حالات کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے بلکہ سرسری اور نامکمل مشاہدہ سے بعض وقت بڑے بڑے نتائج نکال لیتا ہے، اور یہ بات بعض مرتبہ مزید بڑھ کر پورا ایک فلسفہ اور مکمل تصور کا شاخسانہ بن جاتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تصور قائم کرنے میں غیر مسلموں کو عموماً یہی بات پیش آئی ہے اور آرہی ہے۔

آپسی زندگی میں مفادات کے ٹکراؤ اور زندگی کے مطالبات کے حصول

کے سلسلہ میں آپسی کشمکش عموماً یہ فضا پیدا کرتی ہے کہ ایک کا تصور دوسرے کے بارے میں خراب ہو جاتا ہے چنانچہ برصغیر ہندو پاک میں جو کہ مختلف مذاہب مختلف نسلوں اور قوموں کا گہوارہ ہے یہ صورت حال پیش آئی اور صرف یہی نہیں کہ پیش آئی بلکہ اس نے یہاں کی نسلوں کے درمیان، یہاں کے مذہبوں کے درمیان، یہاں کی زبانوں کے درمیان اور یہاں کی تہذیبوں کے درمیان تناؤ پیدا کر دیا۔ یہ تناؤ انسانیت کی قدروں اور علم وادب تک پہونچا اور اسی کا اثر ہے کہ اردو کا لفظ اور اسلام کی اصطلاح یہاں کے پڑوسی غیر مسلموں کے ذہنوں میں بدگمانی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

یہ کیفیت غیر مسلموں سے آگے بڑھ کر ان مسلمانوں کے ذہنوں تک بھی پہونچ رہی ہے جو ان غیر مسلم لوگوں کی سوسائٹی میں رہتے اور ان کی تعلیم و ثقافت میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔

اردو زبان کے ساتھ بھی اس ملک میں تقریباً یہی مشکل پیش آئی کیونکہ اردو مسلمانوں میں زیادہ رائج رہی اور مسلم حکمرانوں کے عہد میں پروان چڑھی اور اس میں اسلامی ثقافت کا لٹریچر بھی زیادہ ہے، لہٰذا وہ غیر مسلم لوگوں کی نظر میں ایک سبھی اور غیر ترجیحی زبان قرار پائی حالانکہ اردو اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور اس کی رنگارنگ تہذیبوں کا سنگم ہے اور اس کی آبیاری مسلم اور غیر مسلم دونوں نے کی ہے۔

اوّلاً مسلم عہد حکومت میں رائج سرکاری زبان فارسی اور ملک وعوام میں رائج ہندوستانی زبان کے آپسی اختلاط سے، ثانیاً دیگر ان غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے جن سے اس ملک کی قوموں کا ربط قائم رہا مثلاً ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور سامراجی حکمراں کی زبان انگریزی، اردو نے ان چاروں

زبانوں سے کسب فیض کیا اور ان سب کی خوشہ چیں بنی، اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں سے نیز مسلم حکمرانوں کے قدیمی وطن ترکستان اور ترکی سے ربط و تعلق کے اثر سے وہاں کی زبان سے بھی اقتباس و استفادہ کیا۔

اس طرح اردو زبان کی تشکیل میں جتنی زبانوں کا اثر پڑا اس کی معاصر اور پڑوسی زبانوں کی تشکیل میں نہیں پڑا اس طرح اردو ایک گلدستہ زبان بن گئی محض کسی ایک محدود ثقافت و قومیت اور کسی ایک قدیمی زبان کی نو زائیدہ نہیں ہوئی، وہ اس متنوع صفات کے حامل ملک کے لئے جتنی موزوں اور نمائندہ زبان ہے دوسری کوئی زبان نہیں ہے۔ اس کو متنوع زبانوں سے ان کا دلکش سرمایہ الفاظ اور ان کے ذریعہ اس ملک کے متنوع احساسات و تاثرات کا سرمایہ بھی حاصل ہوا۔

اردو کے ساتھ مخالفانہ یا معاندانہ رویہ اختیار کرنا صرف ایک زبان کے ساتھ نا مناسب سلوک نہیں بلکہ کئی طرح کی اور کئی پہلوؤں کے ساتھ زیادتی اور ظلم ہے جو صرف زبان ہی پر نہیں بلکہ ملک کے متنوع فطری جذبات قلب اور محسوسات ذہن کے ساتھ بھی زیادتی ہے کہ ایک مشترک اور متنوع رنگ کی تہذیب کی غمازی کرنے والی زبان کو ختم کر دیا جائے۔ ایسی متنوع مذہبوں اور نسلوں کے قوم کو ایک متنوع خصوصیتوں کی زبان سے ہٹا کر اور صرف ایک نئی تیار کی گئی زبان پر ڈال دیا جائے، جو صرف ایک فرقہ اور ایک تہذیب کی ترجمان ہے، اس کی اہمیت تسلیم اور اس کی ضرورت بھی صحیح ہے لیکن ایک تہذیب و ادب سے بھر پور زبان کو ختم کرنا زیادتی کی بات ہے لیکن افسوس ہے کہ ملک کے سیاست زدہ ذہنی تناؤ کی فضا میں اس اہم حقیقت کو محسوس نہیں کیا جا رہا ہے اور اردو جیسی زبان کو بتدریج ختم کیا جا رہا ہے اس کا خاتمہ اس ملک کی ایک عظیم تہذیبی خصوصیت کا خاتمہ بھی ہوگا جو ایک بڑا خسارہ اور نقصان ہوگا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو علمی لحاظ سے وہ ملک کی سرکاری زبان میں اپنے لئے جو تمدنی اور علمی کمی محسوس کریں گے، وہ انگریزی ہندی اور دیگر رائج الوقت زبان سے اور جو مذہبی کمی محسوس کریں گے وہ عربی سے پوری کر لیں گے اور وہ اس طرح کسی بڑے خسارہ میں نہ رہیں گے، عربی دنیا کے ۲۵ متمدن ملکوں کی زبان ہے اور اس میں پندرہ سو سال کا تہذیبی و علمی و دینی سرمایہ ہے جو مسلمانوں کے لئے سب کچھ ہے اور وہ ان کو ہر دیگر زبان سے مستغنی بنا سکتا ہے لیکن اس ملک کے دیگر باشندوں کو اردو کے خاتمہ کے بعد اس کا نعم البدل حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور یہ ملک کے لئے تہذیبی و تمدنی اور علمی لحاظ سے زبردست خسارہ ہے حکمراں اور دوسرے طبقہ کو سمجھنا چاہیئے۔

ارض القرآن

ایک بڑا علمی کارنامہ

کتاب ارض القرآن، جغرافیہ پر ایک غیر معمولی کتاب ہے، اور یہ اس ضرورت سے تصنیف کی گئی کہ علاقہ ہائے عرب خصوصاً اس کے وسطی علاقہ کی جغرافی تحقیق جدید محققین جغرافیہ وآثار قدیمہ کی کامل توجہ حاصل نہیں کرسکی تھی، اور مواد کی کمی تھی، اس کمی کا مداوان سید صاحبؒ نے اپنے ممکنہ مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ کیا، اور اس کمی کو کمی باقی رہنے نہیں دیا۔ یہ ایک کارنامہ ہے، جو اردو زبان کے حصہ میں آیا، یہ ایسا کام تھا جو دنیا کی دیگر زبانوں میں اور خاص طور پر ان زبانوں میں جن میں اسلامی لٹریچر پایا جاتا ہے، ترجمہ کرکے لایا جاتا اور یورپ کی زبانوں میں بھی نقل کیا جاتا تاکہ یورپ والے دیکھتے کہ علمی وتحقیقی کاوش صرف مغربی قوموں میں ہی نہیں ہے بلکہ ان سے بھی بہتر اور دیانت دارانہ طریقہ سے کی جاسکتی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی اس کتاب میں علمی تحقیق کا وہ اعلیٰ طریقہ اختیار کیا ہے جو تحقیق کے اعلیٰ ترین عملی معیار پر پورا اترتا ہے جس

پر عمل کرنے کا دعویٰ یورپ کے معیاری محقق کرتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ ان محققین میں سے متعدد دیانت وامانت کے معیار کو پورا نہیں کر سکے ہیں، جہاں تک ارض الانبیاء اور تاریخ الانبیاء کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں علمی مواد کا خاصہ حصہ توریت اور عبرانی زبان کی کتابوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ ان سے استفادہ کے لئے مولانا نے عبرانی زبان سیکھی تا کہ ان دونوں موجودہ معلومات کا براہ راست مطالعہ کر سکیں، انگریزی زبان سے ان کو واقفیت پہلے سے تھی جس کے ذریعہ عصر جدید کے محققین یورپ کی تحقیقات اور مقامات کے مشاہدات کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات سے واقفیت ان کو حاصل ہو رہی تھی۔

مولانا نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قرآن وحدیث میں آئے ہوئے اشاروں وتذکروں سے حاصل کردہ معلومات سے ان کا موازنہ بھی کرتے رہے۔ چنانچہ یورپ کے محققین کے متعدد اندازوں یا تبصروں کی غلطیاں بھی نکالیں اور ان سب کو انھوں نے جمع کیا، اس طرح انھوں نے اعلیٰ علمی کام انجام دیا جو علم کے زیادہ سے زیادہ غیر جانب دارانہ تقاضوں کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔

مولاناؒ نے اس کام کی معنویت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمہ کتاب میں تحریر فرمایا ہے:

> ''اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات مذکورہ کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور متقدمین کی لغزشیں علی الاعلان آشکارا ہو جائیں۔''

اور موضوع کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں، اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور غیروں کو انھیں افسانہ (LEGEND) کہنے کی جرأت ہوئی۔''

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے تذکرے آئے ہیں جو نصیحت وعبرت کا سامان رکھتے ہیں اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان میں صحیح واقعہ بیانی کے ساتھ بڑی تاثیر بھی ہے، لیکن وہ واقعتاً عام انسانی قصوں اور کہانیوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ عبرت واصلاح حال کا کام کرتے ہیں، قرآن مجید میں صرف سبق آموز واقعات کو ان کے صرف سبق آموز پہلوؤں کے اندر رکھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیلات اور ان کے متعلقات کی وضاحت قرآن مجید میں نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والوں کی واقعیت اور مزید واقفیت کے لئے ان کو ان کی صلاحیت وجستجو وتحقیق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ذکر کئے گئے قصے اور واقعات زیادہ تر انھیں علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو قرآن مجید کے اول مخاطبین یعنی عربوں کے زیر قدم رہے۔ وہ ان کی ضروری معلومات سے واقفیت رکھتے تھے۔ لہذا

اصل بات کو سمجھنے میں ان کو آسانی ہوئی اور مقصد پورا ہوا لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے موقع ومحل وپس منظر اتنا واضح نہیں رہا جتنا اگلوں کے لئے تھا۔ کیونکہ مرور زمانہ سے بعض جگہوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ بعض راستوں اور مقامات میں بھی فرق آجاتا ہے۔ پھر قرآن مجید دوسری قوموں اور علاقوں تک پہونچا جہاں کے رہنے والے قرآن مجید سے تعلق رکھنے والے ان مقامات اور علاقوں سے بلاواسطہ کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کو قرآن مجید کے ان اشاروں اور حوالوں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جو علاقہ کے حالات سے تعلق رکھتے ہیں دشواری تھی، اور ان کو ان کی مزید وضاحت وتشریح کی احتیاج تھی، اور وہاں کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی مختلف باتیں ان علاقوں کی جغرافیائی وتاریخی حقیقت جاننے کے لئے بھی ایک حد تک محتاج تھیں۔ اس سبب سے قدیم مسلم علماء نے اس موضوع کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا، اور تحقیق وجستجو بھی کی، پھر اس سلسلہ میں اپنی معلومات قلمبند کیں۔ جن سے نئے پہلو سامنے لائے اور مرور زمانہ کے ساتھ یہ سلسلہ قائم رہا۔ اور اس کو اس موضوع پر تصنیف کی جانے والی متعدد کتابوں میں یا تاریخ اور قوموں کے حالات پر مشتمل مختلف کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں میں تفسیری کتابیں سیرت کی کتابیں، پھر جغرافیائی اور تاریخی موضوع کو سامنے رکھ کر لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن اس سلسلہ کی معلومات کے لئے عموماً توریت اور یہودی کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ کیونکہ گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے حالات کا تذکرہ یہودی مصنفوں نے خاصہ کیا ہے۔ لیکن یہودی روایات میں جگہ جگہ مبالغہ بھی ملتا ہے، اور تغیر وتبدل کا عمل بھی خاصا ہوا ہے۔ اس لئے متعدد معلومات شک پیدا کرتی

ہیں۔اسی لئے عباسی عہد میں جو مسلمانوں کے علمی عروج کا زمانہ ہے مزید تحقیق وجستجو کے ذریعہ اور قدیم زمانوں کے کتبات کے ذریعہ قرآن مجید میں مذکور قوموں کے واقعات وحالات سے نسبت رکھنے والی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، اور کتابوں میں درج کی گئیں۔ پھر گزشتہ آخری صدیوں میں یورپ نے جو علمی وعملی زندگی کے لحاظ سے عروج پر تھا، اپنے علمی شغف رکھنے والے متعدد اہم اصحاب علم وتحقیق کے ذریعہ مزید باتیں معلوم کیں۔اس طرح اس موضوع پر موجود قدیم سرمایہ میں اضافہ ہوا۔ ان معلومات میں جہاں تک یورپ کی تحقیقات کا تعلق ہے تو ان کے علماء کی اسلام اور عربی خصوصیات سے عدم واقفیت کی وجہ سے متعدد مقامات میں مطلب اخذ کرنے میں ان سے غلطیوں کا ارتکاب ہوا۔غالباً یہی وجہ تھی کہ علم قدیم وجدید کے جامع مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا جو ایک طرف قرآن مجید کے جغرافیائی اشاروں اور حوالوں کے سمجھنے میں مدد دے اور دوسری طرف اسلام مخالف محققین نے جو غلط نشاندہی کی ہوں اس کے ذریعہ ان کا ابطال بھی ہو۔مولانا نے اپنی اس کتاب میں تاریخی وجغرافیائی معلومات کے سلسلہ میں بہت سی اہم ترین گتھیاں سلجھائیں جن میں سامیوں کا اصل مسکن، عاد وارم کا تعلق، عاد وثمود کا اولیٰ وثانیہ ہونا، اور ان کے قبائل کے علاقوں کی وسعت اور ان کا صحیح تعین، عیسائیت ویہودیت کا جزیرۃ العرب میں داخلہ اور ان کے اثرات، سبا کے عروج وترقی اور ان کی نسلی اقسام، اور اس طرح کی دیگر معلومات قرآن مجید کے بہت سے اشاروں کے سمجھنے میں معاون ہیں۔

مولانا نے یورپین محققین کے متعدد دعووں اور اندازوں کا ابطال کیا

اور یہ ابطال محض دینی بنیاد پر نہیں بلکہ ان سے واقفیت اور عقلی قرآئن اور علمی بنیادوں پر کیا۔ اور جگہ جگہ یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ یورپین محققین کی تحقیق ان کی ناواقفیت یا تعصب پر مبنی ہے دراصل یورپ کے غلبہ وعروج کے زمانہ میں ان کے متعدد محققین نے اسلامی خوبیوں کو دبانے کی مصلحت کو بھی سامنے رکھا، وہ اس کے زیر اثر بھی اپنی تحقیقات کے نتائج نکالتے تھے یہ لوگ مستشرق کہلاتے تھے، اور اپنے اپنے علمی انداز تحقیق کے رعب سے علم میں کمی رکھنے والوں کو متاثر کرتے تھے، چنانچہ بہت سے مسلمان ذہنوں کو انھوں نے متاثر کیا، سید صاحبؒ اپنے مقدمہ میں ان کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"وہ مسلمان نہیں یہودی اور عیسائی ہیں انھوں نے نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے۔ بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے۔"

سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"آثار قدیمہ کے انکشافات نے ادیان عرب قبل اسلام کی معلومات میں نہایت انقلابات پیدا کر دیئے ہیں، جس سے اسلام کے مناقب وفضائل کا ایک نیا باب پیدا ہو گیا ہے۔"

بہر حال نہایت ضروری تھا کہ ہمارے دشمن جن جدید معلومات کو ہماری مخالفت میں صرف کر رہے ہیں ان سے اپنی موافقت کے پہلو پیدا کیے جائیں۔

سید صاحبؒ نے ان غلط کار محققین کی تشریحات کو جگہ جگہ بے نقاب

کیا اور صحیح تشریحات پیش کیں۔اس طرح سید صاحب کی یہ کتاب صرف قرآنی جغرافیہ ہی نہیں بلکہ جغرافی علم کلام کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، جس کے ذریعہ اسلامی چہرہ پر ڈالے گئے غبار کو صاف کیا گیا ہے۔اور غلط کاروں کی معاندانہ حکمت عملی کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔

سید صاحبؒ نے اس سلسلہ میں تذکرہ واظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

یہ عجیب بات ہے کہ غیر مسلم اہل علم نے اپنی توجہ ہماری مقدس کتاب کے مطالعہ وتحقیق پر صرف کی جرمن، فرانسیسی اطالوی اور انگریزی مستشرقین نے عربوں کی ماقبل اسلام تاریخ پر تحقیقی کتابیں لکھیں جن میں ان کی علمی وتحقیقی محنت کا اظہار بھی ہوا ہے، اور رومی اور یونانی کتابوں کی تلخیص پیش کی جس کے ذریعہ عربوں کے قدیم زمانے کی جو باتیں ان میں تھیں ان کو موجودہ عہد کے سامنے لائے اور ان قوموں کے بارے میں معلومات وتحقیقات پیش کیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔اور کتبے اور نقوش جو پرانی جگہوں میں ملے ان کو حل کیا اور ان سے معلومات لیں۔لیکن یہ مستشرقین مسلمان نہ تھے۔یہودی اور عیسائی تھے۔انھوں نے اپنے مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ متعدد حقائق کو بگاڑا اور متعدد مستشرقین نے اپنی حاصل کردہ معلومات سے ان کے دلوں میں جو معاندانہ جذبہ تھا، اس کے تحت کام کیا، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ابوریدہ فارسٹر نے عربوں کے تاریخی جغرافیہ پر کتاب لکھی اس میں

حقائق میں ایسی تحریفات کیں کہ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔
نولدیکی نے عمالقہ اور عاد کے سلسلہ میں یہ اظہار خیال کیا کہ یہ
خیالی نام اور قومیں ہیں۔ تاریخ سے ان کا ثبوت نہیں ملتا، اور
رابرٹ اسمتھ نے عربوں کے صحیح النسب ہونے سے انکار کردیا۔
مولاناؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ معاملات مستشرقین
نے اٹھائے ہیں یہ بظاہر تو تاریخی وادبی مباحث ہیں لیکن ان کا
اثر براہ راست قرآن مجید کی طرف سے ظاہر کئے ہوئے حقائق
پر پڑتا ہے۔ اس طرح اس کو ایک ایسی سازش قرار دیا
جاسکتا ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید پر اعتماد کو کمزور کیا جانا
مقصود ہو اور عربوں کو جو خدا کی طرف سے اسلام کے حاملین
اول بنائے گئے ناقابل اعتبار قرار دینا ہے۔ لیکن ان مستشرقین
کی ان آراء کا علمی جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ ان مستشرقین
کی عربی زبان میں کمزوری اور عربی زبان کے ادبی ذوق کے
فقدان کی وجہ سے ہوا ہے۔ مزید یہ کہ ان میں جو اسلام کے
خلاف تعصب تھا اور اپنے عیسائی مذہب کے جو تصورات تھے
وہ ان کا باعث تھے۔

عربوں کے حسب ونسب پر مستشرقین نے جو شک وشبہ ظاہر کیا
ہے اور ان کے قبائلی انتساب کو بتوں اور ان کے تراشیدہ خداؤں سے متعلق
کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولاناؒ نے اس کی سخت تردید کی ہے اور ثابت کیا
ہے کہ ان کو اپنے دادا کی طرف جو نسبتیں حاصل تھیں انھیں سے وہ موسوم
ہوئے اور ان ہی کی طرف وہ منسوب ہوئے، اور یہ کہ نولدیکی نے عرب

انساب کو جو خرافات قرار دیا یہ ان کی غلط رائے ہے۔ سامی قوموں کے وطن اصلی کے سلسلہ میں بھی مستشرقین نے طرح طرح کی باتیں لکھیں، مولاناؒ نے دلائل سے ثابت کیا کہ جزیرہ عرب کا وسطی شمالی علاقہ ان کا وطن اصلی رہا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد محققین عرب کے اقوال پیش کئے ہیں۔ اور قرآن مجید سے بھی دلیل پیش کی ہے "لتنذر أم القریٰ ومن حولها" کے یہ الفاظ بھی وسط عرب کو مرکز قرار دیتے ہیں۔ بعض مستشرقین نے اکثر عرب شعراء کو عیسائی قرار دیا ہے۔ مولاناؒ نے اس کی سخت تردید کی جن شعراء کے یہاں عیسائیت کی باتیں یا الفاظ ملتے ہیں وہ عیسائی ہونے کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ عیسائی بادشاہ کے دربار میں اپنی شاعری کو باوزن بنانے کے لئے تھے۔ ورنہ عربوں میں عیسائی بہت ہی کم تھے اور یہودی ان سے بھی کم تھے۔

جزیرۃ العرب میں قبل اسلام کے مذاہب کے عنوان سے بھی مولاناؒ نے اہم تفصیلات بیان کی ہیں۔ خاص طور پر عیسائیت، یہودیت کے جزیرۃ العرب میں در آنے کی تفصیل پھر ان دونوں کی آویزش پھر اس آویزش کے نتیجہ میں پیش آنے والے واقعات مثلاً اصحاب الاخدود۔ اور اسی طرح اصحاب الفیل، کے واقعات مولاناؒ نے صابئیت اور حنفیت کے الفاظ اور ان کے اصل محل استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ خاص بات بتائی ہے کہ عراق کے ستارہ پرست دراصل اپنے لئے صابی کا لفظ اچھے مفہوم میں استعمال کرتے تھے جس کے معنی دھونے اور غسل کرنے کے تھے۔ اور ستارہ طلوع ہونے کو بھی صبا کہا گیا ہے۔ اصلاً عراق کا سابق مذہب ستارہ پرستی اس لفظ کا بنیادی مفہوم بنا، اور پھر یہ مذہب بتدریج نئی پرانی

خصوصیات کا مذہب بن گیا جس کے ماننے والے عربوں کی سوسائٹی میں بعد میں بھی ملتے ہیں، ان میں سے بعض نے علمی شہرت بھی حاصل کی۔

صابئیت کے ساتھ حنفیت کی تحقیق بھی سید صاحبؒ نے دلچسپ پیش کی یہ لفظ بھی قدیم اہل عراق کے صابئیت کے لفظ کا معاصر تھا اس کے معنی اعراض کے یعنی ستارہ پرستی سے اعراض کے تھے۔ اور یہ اہل عراق نے حضرت ابراہیمؑ کی مذمت کے طور پر ان کے لئے استعمال کیا تھا۔ جو غیر اللہ سے اعراض وصرف نظر کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے اچھا وصف بنا، اور خالص اسلام کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ جس طرح اسلام کا لفظ چھوڑ دینے اور دوسرے کے حوالہ کر دینے کے معنی میں ہونے کی وجہ سے غیر اللہ کو چھوڑ کر اپنے کو اللہ کے حوالہ کر دینے کے ہو گئے اور وہ خالص دین اسلام کے معنی میں ہو گیا۔

سید صاحبؒ نے قرآن مجید میں ذکر کی گئی قوموں کے سلسلہ میں تحقیق وعلمی جستجو سے کام لیتے ہوئے ان کا نسلی سلسلہ اور ان کے قیام وعمل دخل کے علاقے، پھر زمانے کے فرق سے ان کے تمدنی وسیاسی عروج وزوال کا اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ اور متعدد ایسی تحقیقات پیش کی ہیں، جن سے ان کی سابقہ معلومات کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور بعض ردوبدل کی صورت سامنے آتی ہے۔

خارق عادت معاملات میں سید صاحبؒ نے عقلی قرینہ کو بھی استعمال کیا ہے، اور کئی جگہ عام مفسرین کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً ثمود کے لیے لائی گئی اونٹنی کے پتھر سے پیدا ہونے کی بات کو قطعی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کو اونٹنی ہی سے پیدا شدہ اونٹنی قرار دینے کو اختیار کیا

اور اس میں قرآن مجید کے الفاظ سے استشہاد کیا ہے۔

اسی طرح اصحاب فیل کے واقعہ میں پرندوں کے کنکریاں مار کر ہلاک کرنے میں بھی کئی اقوال نقل کئے ہیں۔ اس کی تشریح خارق عادت کے طور پر نہیں کی ہے۔ اسی طرح ملکہ سبا کے تخت کے لانے میں جو عجلت ظاہر ہوئی تھی اس میں بھی خارق عادت کے علاوہ بات بھی ذکر کی ہے۔

سید صاحبؒ نے عالمانہ اور تحقیقی معاملات کے طریقہ تحقیق و بحث کو ہی اپنایا ہے لیکن مذہبی و اسلامی معاملات میں کسی شک و تردد کے انداز سے کوئی مفاہمت نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف جگہ جگہ مغربی محققین کی تحقیقات کی علمی و عقلی غلطیاں نکالی ہیں اور متعدد معاملات میں ان کی جہالت کو آشکارا کیا اس طرح علمی دنیا میں ان مستشرقین کی علمی شہرت و عظمت کے خلاف ثبوت فراہم کیا جس سے ان کے اور پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اہل تحقیق جن کی باتیں پہاڑ کی طرح مضبوط معلوم ہوتی رہی ہیں۔ ہر جگہ اپنی تحقیق و علمی موشگافی میں دیانت و امانت کو قائم نہیں رکھ سکے۔

ارض القرآن کی تصنیف مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس عہد میں کی جس میں خاص طور پر حجاز کی مقامی معلومات اور وہاں بسنے والے قبائلی کے سلسلہ کی بعض ایسی معلومات جن سے قرآن مجید اور حدیث شریف میں آنے والے متعدد علاقائی یا قبائلی اشاروں کی بالجزم تحقیق ہوا نتظام نہیں تھا۔ اس علاقہ کے حکمرانوں کے مالی وسائل کی کمی، علم سے اشتغال کی کمی اور علاقہ کے صحرائی ہونے اور وسیع رقبوں میں پھیلے ہونے کی وجہ سے معلومات کا حصول خاصا دشوار بنا ہوا تھا۔ حجازی مقامات کے تقدس کی وجہ سے یورپ کے اہل تحقیق بھی پوری دلچسپی کا ثبوت نہ دیتے تھے، اور نہ دے سکتے تھے،

اس کی وجہ سے بعد کے دور میں وہاں کی تفصیلی اور گہری معلومات حاصل نہ کی جاسکیں، حالانکہ قرآن مجید میں آئے ہوئے ایسے مضامین جن کا تعلق علاقہ کے باشندوں کے صلح و جنگ اور مقامی یا قبائلی حال سے تھا، ان میں موجود اشاروں کو سمجھنے کے لئے علاقہ کے مقامات اور باشندوں کی خصوصیات و حالات سے زیادہ واقفیت کی ضرورت سامنے آتی ہے، مقامات کے جائے وقوع سے متعلق امور سفر ہجرت میں پڑنے والے مقامات کی جگہوں کا تعین، غزوہ بدر میں جانے کے لئے سفر میں پڑنے والے مقامات کا تعین جن کا قدیم کتابوں میں فرسخ اور منزل کی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے، جائے وقوع کے صحیح تعین میں دشواری ہوتی ہے، ضرورت تھی کی اس کو تحقیقی سفر کر کے سمجھا اور متعین کیا جاتا لیکن، حجاز کے حالات اس کے مساعد نہ بنے تھے کہ یہ کام ہوتا، وہاں کی مادی اور علمی صورت حال کے بہتر ہونے کے بعد اس کام کو بعض محققین نے کیا اور اس سلسلہ میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اسی طرح حرم مکی کے حدود جو مقامات کے ناموں سے بتائے جاتے ہیں ان کا جائزہ سفر کر کے لینے کا تھا جس کو ابھی صرف چند سال پہلے ایک حد تک انجام دیا گیا، اس تحقیق میں عہد عباسی اور ترکی زمانہ کے ان نشانات کا بھی پتہ چلایا گیا جو حدود کے تعین میں مدد کرتے ہیں۔ متعدد مقامات کے ناموں میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے ان میں کئی کا تعین مشکل بن گیا تھا ان میں سے متعدد کو باقاعدہ تحقیقی جائزے سے اب سمجھا گیا۔ یہ لٹریچر اگر ارض القرآن کی تصنیف کے وقت آ گیا ہوتا یا تحقیق کا یہ کام انجام پا گیا ہوتا تو ارض القرآن میں اس کو بھی جگہ ملتی۔ ضرورت ہے کہ کتاب میں بعض ضمیمے شامل کئے جائیں تا کہ اس کی معلومات تازہ اور زیادہ ہوں اور اس کو

انفرادیت کا مقام حاصل رہے۔

بہر حال مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ارض القرآن، قرآنی جغرافیہ پر ایک عظیم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کی یہ حیثیت باوجود متعدد نئی کتابوں کے تیار ہو جانے کے برابر قائم ہے، اس کو تا حال خراج تحسین اردو دانوں سے مل رہا ہے۔ اگر مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے آجائیں تو دوسری قوموں کے اہل علم سے بھی اس کو خراج تحسین ملے گا۔

صحافت عصر حاضر میں

صحافت کی اہمیت

عصر حاضر میں وسائل نشر واعلام اور ذرائع ابلاغ کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، موجودہ صحافت نہایت ہمہ گیر اور مؤثر ترین سطح پر پہونچ چکی ہے۔ آج اس سے وہ کام لئے جارہے ہیں جو بمبار طیاروں اور دور مار میزائیلوں سے نہیں لئے جاسکتے۔ اہل خلوت واہل سیاست کے ذہن بنانا، ان کی رایوں کو تیار کرنا، حکومتوں کی ساکھ گرانا یا بڑھانا، تدابیر سوجھانا، حوصلہ افزائی یا ہمت شکنی کرنا یہ سب کام آج کی صحافت انجام دے رہی ہے۔ اچھے کردار کی مالک شخصیتوں کو صحافتی شعبدہ بازی کے ذریعہ ذلیل ورسوا بنانا، اور قاتل وظالم لوگوں کو ملک وقوم کا مخلص خادم اور غمگسار ثابت کردینا، کسی کی کرسی متزلزل کردینا، کسی کی کرسی مضبوط بنادینا موجودہ صحافت کا وطیرہ بن گیا ہے۔ آج کا انسان صرف وہی سنتا اور مانتا ہے جو صحافت، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ویڈیو، فلم، اور پمفلٹ اس کو دکھاتے یا سناتے ہیں کیوں کہ دنیا کو، اور اپنے قریب وبعید کے انسانوں اور ان کے معاملات کو جاننے کے صرف یہی ذرائع ہیں اور یہ ذرائع خاص ہاتھوں میں ہیں اور خاص ذہنوں کے پابند ہیں جو

اپنے مخصوص مقاصد رکھتے ہیں، وہ ان مقاصد کے لئے دروغ گوئی، ملمع سازی، الٹ پھیر، اور سخن سازی کے ہر طرح کے طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔

اور یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے کہ ایک بالکل معمولی خبر بار بار بڑی اہم صورت بنا کر پیش کی جائے تو سیکڑوں افراد بے ساختہ یقین کرنے لگیں گے، اور اب مسئلہ سیکڑوں کا نہیں رہا۔ اب معیاری روزنامے روزانہ کئی کئی لاکھ نسخوں کی تعداد میں نکلنے لگے ہیں، ایسے اخبارات میں کوئی بھی خبر چھ، سات لاکھ آدمی بیک وقت پڑھتے اور یقین کر لیتے ہیں۔

بعض حکیمانہ کتابوں میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار چند شاطر افراد نے ایک شخص سے بکرا چھیننے کا پلان بنایا جو اسے رسی میں باندھے لیے چلا جا رہا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ ان میں سے ہر ایک اس بکرے والے کے پاس سے باری باری گذرے اور کوئی ایسی بات کہے جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ بکرا نہیں کتا ہے۔ چنانچہ پروگرام کے تحت پہلا چور آیا اور اس نے کہا کہ جناب آپ کا کتا بڑی اچھی نسل کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا آیا اور بولا: جناب والا! آپ کے کتے کی آنکھیں بڑی چمک دار معلوم ہوتی ہیں۔ تیسرا آیا اور بولا: حضرت! آپ کے اس کتے کی کیا قیمت ہوگی؟ اسی طرح چوتھا اور پانچواں بھی آیا، اور کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ضرور کہا جس سے معلوم ہو کہ یہ کتا ہے، بکرا نہیں۔ چنانچہ اس شخص نے وہم اور آسیب سمجھ کر بکرے کو چھوڑ دیا، کہ وہ غالباً دھوکے میں کتے کو بکرا سمجھ کر لے جا رہا ہے، وہ یہ سمجھا کہ مجھ پر جنون کا اثر یا شیطانی سایہ پڑ گیا ہے تبھی تو مجھے کتا بکرا نظر آ رہا ہے۔

موجودہ حالات میں بھی صحافت کا اور ریڈیو کا یہی اصول اور شعار ہے کہ وہ غیر اہم اور بے بنیاد بات کو بھی اتنی طاقت سے اچھالتے ہیں کہ وہ اہم

ترین اور بالکل صحیح اور نتیجہ خیز بات معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی کرتے ہیں، اور بہت سی باتوں کو ان کے صحیح حال میں بھی نہیں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کا غلط اس میں چھپ سکے۔

عالمی صحافت یہودیت کے چنگل میں

باوجودیکہ یہودیت آج دنیا میں بہت قلیل تعداد میں پائی جاتی ہے، اس کے باوجود وہ عالمی صحافت اور ذرائع ابلاغ پر پوری طرح قابض ہیں۔ دنیا کے تمام ملکوں خصوصاً عالم اسلام میں وہ بارودی سرنگوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ حقائق کو مسخ کرکے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں یہودی صحافت کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ جس واقعہ کو جس رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں پیش کرتے ہیں، پوری دنیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے، مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، اور اگر کہیں اتفاق سے کسی یہودی کے تلووں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو اسے صفحۂ اول میں جلی سرخیوں میں شائع کرتے ہیں۔

کوئی بھی مسلم حکمراں، یا امیر جب کوئی ایسا اقدام کرتا ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہونچتی ہو تو اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، اور بنیاد پرستی، تاریک خیالی، ظلم و بربریت کا الزم لگاتے ہیں۔ اور دنیا کے سامنے اسے اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہی پوری انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ البتہ ان سیاست دانوں اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں ضرور زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں جو ان کے خونی ہاتھوں کا کھلونا بنے رہتے ہیں، اور ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل اور صیہونی منصوبوں کی تنفیذ کے لئے آلۂ کار بنے رہتے ہیں۔

عصر حاضر میں ہر اسلام پسند کو رجعت پسند، اصول پرست، دقیانوس، تشدد پسند، دہشت گرد، فنڈامنٹلسٹ، انسانی حقوق کو پامال کرنے والا، جیسے القابات سے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خود امریکہ کے اندر یہودی بہت معمولی تعداد میں ہیں، مگر وہاں کی بھی سیاست کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھوں میں ہے امریکہ کی خارجہ پالیسی انھیں کے اشارۂ ابرو پر طے پاتی ہے۔ وہ جس کو پسند کرتے ہیں اس کے لئے ایسی صحافتی و مالی تقویت کا ذریعہ بنتے ہیں کہ وہ کرسیٔ صدارت تک پہونچنے کا آسان راستہ پالیتا ہے۔ اور جسے ناپسند کرتے ہیں اس کی خوبیاں صلاحیتیں، اور فائدہ مندی کچھ کام نہیں دیتی، اور وہ کرسی حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے، اور یہی وہ داخلی محرک ہے جو امریکہ کو اسرائیل کی پشت پناہی اور حمایت پر مجبور کرتا ہے، حالانکہ امریکہ کی غالب آبادی عیسائیت اور سیاہ فاموں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

یہودی صحافت کی کامیابی کا راز

اور اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ پڑھنے لکھنے، تحقیق و مطالعہ اور بحث و نظر میں کافی جاں فشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں، اور کسی بھی خاص موضوع سے متعلق تحقیق کے نقطۂ انتہاء، تک پہونچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، تاکہ وہ جو بھی رائے پیش کریں اس میں ایک وزن ہو۔ انہیں وجوہات کی بنیاد پر جب وہ کسی نظریہ اور فکر کو علمی حلقے میں پیش کرتے ہیں تو ان کے علمی رعب سے متاثر ہو کر ان کی رائے کو لوگ وزنی سمجھنے لگتے ہیں، اس سلسلے میں انسانی نفسیات کا سمجھنا مفید ہے۔ سامع یا قاری کی صلاحیت، فہم و لیاقت، صلاحیت اخذ، اور پسند و ناپسند کی نفسیات کو سامنے رکھنا مفید ہوتا ہے۔ یورپ

اور امریکہ کی تعلیم وثقافت میں صحافت وذرائع ابلاغ کو انہی اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے۔ اور چونکہ وہاں کے ہر ذرائع ابلاغ پر یہودی غالب ہیں لہٰذا اس کا فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں، اور اٹھا رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے کلیدی منصوبوں پر یہودی طویل پلاننگ اور سخت فکر وتدبر سے پہونچے ہیں، اور پہونچ جانے کے بعد اب ذہنوں کی کنجی ان کے ہاتھوں میں ہے۔

مغربی صحافت کا یہ حال ہے کہ اس وقت وہاں کا ہر اخبار تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے، اور ہر نسخے کو پڑھنے والے بھی دو تین افراد ہوتے ہیں، اس طرح ایک اخبار سے کم از کم تین چار لاکھ افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ اخبارات عموماً کئی درجن صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں اور تعطیل کے روز یہ صفحات سو ڈیڑھ سو صفحات تک متجاوز ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود ان کی قیمت وہی عام قیمت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان اخبارات کا یہ خسارہ دراصل اشتہارات سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور اخبار حقیقت میں اس کے بغیر اپنے مصارف کو پورا نہیں کر پاتا، یہ بات دنیاوی اور غیر دینی اخبارات کو زیادہ حاصل ہے۔ پابند اخلاق واقدار کو کم حاصل ہے۔ لیکن پابند اخلاق واقدار اخبارات کی سرپرستی اصلاح پسند ادارے اور نیک مقاصد کے حامل سرمایہ دار کر سکتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں خیر کو تقویت پہونچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

روزناموں کے صفحات کی یہ بڑی تعداد اسی لئے ہوتی ہے کہ ان میں ہر قسم کی معلومات شامل ہوتی ہیں، اس کے الگ الگ صفحات اور ابواب ہوتے ہیں تاکہ جس کو جس موضوع سے دلچسپی ہو اس کا مطالعہ کرے۔ مثلاً سیاسی، اقتصادی، تجارتی، ثقافتی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، سماجی اور اشتہاری وغیرہ، ایک موضوع کو پڑھ کر ایک آدمی چھوڑ دیتا ہے۔ اور دوسرا شخص اسی اخبار سے دوسرے

موضوع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اسلامی صحافت

اسلامی صحافت عصر حاضر میں وسیع پیمانہ پر نہیں چل رہی ہے۔ مغربی صحافت کے مقابلے میں تو بہت پیچھے ہے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے اسلامی صحافت نے بلاد عربیہ میں اچھی ترقی کی ہے، عربی ممالک جو دولت مند ہیں ان کے اہل خیر کی سرپرستی اسلامی صحافت کو خاصی ملنے لگی ہے، اسی سے ان کو تقویت پہونچی۔ یہ صحافت کہیں کہیں مغربی صحافت کے معیار کو چھونے لگی ہے، اور وہ اثر انداز بھی خاصا ہونے لگی ہے۔ آج عالم اسلام خصوصاً عالم عربی سے سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں رسائل و جرائد نکل رہے ہیں، ان میں سے متعدد جو اپنے ظاہری محاسن اور رنگ و جمال کے ساتھ ساتھ معنوی خوبیوں میں بھی ممتاز ہوتے ہیں۔ ان پرچوں کو کسی بھی مغربی پرچے کے بالمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی صحافت امت اسلامی کے اتحاد کا علامتی نشان ہے

موجودہ اسلامی صحافت درحقیقت امت اسلامی کی یک جہتی، یگانگت، اور اتحاد کے لئے مہمیز کا کام کرنے لگی ہے۔ آج ملت اسلامیہ کے بہت سے نوجوان عموماً اس نقطۂ نظر سے عالمی تبدیلیوں، اور بین اقوامی حوادث کو دیکھنے لگے ہیں، جس کی جانب نئی نسل کو متوجہ کرنا ضروری تھا۔ اسلامی صحافت اس عمل کو انجام دے رہی ہے۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز یکسر بدلتا جارہا ہے، اور وہ آہستہ آہستہ مغربی زبان میں گفتگو کرنے کے بجائے، عزت نفس، اور خودداری کی زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں۔ دین سے شغف بڑھ رہا ہے، ہر طرف

اسلامی لہر، اسلامی بیداری، اسلامی انقلاب، اسلام پسندی، اسلام کی واپسی کے نعروں کی جو صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے وہ بھی اسلامی صحافت کی ہی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

اسلام پسندوں کے غلغلہ سے مغربی اور یورپی حکمرانوں خصوصاً وہائٹ ہاؤس کے مکینوں کی نیند حرام ہونے لگی ہے۔ چنانچہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہودیت اور عیسائیت ایک پلیٹ فارم سے اسلام پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں اسلامی حدود اور شرعی قوانین کے نفاذ کی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ اسلامی صحافت کی دین ہے، اسلامی صحافت کے حرکت میں آنے کی وجہ سے ہمیں اصل حقائق سے واقفیت بھی ہوتی ہے، ورنہ کیسے معلوم ہوتا کہ عراق، فلسطین، بورما، فلپائن، الجزائر، صومال، روسی جمہوریاؤں خصوصاً بوسنیا، اور آذربائجان وغیرہ میں کیا ہو رہا ہے؟

مغربی ذرائع ابلاغ ان تمام خونچکان مظالم اور دہشت و بربریت پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ جو مغربی بھیڑیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اوپر ڈھائے جاتے ہیں۔ مگر آج اسلامی صحافت ان کے جھوٹ کا پول کھول دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رسائل واخبارات نے ملت اسلامیہ کو ایک رسی سے منسلک کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی اسلامی صحافت کے اندر ابھی بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اور اسے وسیع پیمانہ پر لانے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں اسلامی صحافت میں ایک عنصر خراب رول انجام دے رہا ہے یہ عنصر صرف نفع بٹورنے اور مالی فائدہ حاصل کرنے کو مقصد بنائے ہوئے ہے۔ اور سنسنی خیزی کو اس کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کو اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ شریف اور باوقار لوگ بے عزت ہو جائیں، اور اسلام کے فرزندوں کی ذلت ورسوائی کا سامان ہو،

ان کو تو اپنی سنسنی خیزی سے رائے کا پربت اور پربت کا رائی بنانا ہے، تاکہ ان کا اخبار فروخت ہو، اور عوام اس کی سنسنی خیزی سے متاثر ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں، اور خوب بکے، یہ اسلامی صحافت نہیں ہے، یہ نام نہاد مسلم صحافت ہے، جو افسوس ہے کہ کامیاب چل رہی ہے۔

جدید صحافت کے رجحانات

ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ جدید صحافت کے مزاج ومیلانات ومقاصد، اور اس کے ظاہر کے پیچھے جو باطن ہے اس کا سمجھنا ہے۔ ورنہ ہم فائدہ اٹھانے کے بجائے نقصان اٹھائیں گے۔ اور پوری قوم کو بھی نقصان سے دوچار کریں گے۔ صحافت کیا ہے؟ اس کے اصول وطریقے اور مؤثر ڈھنگ کیا ہیں؟ اس کی راست بازی اور عیاری کیا ہے؟ اور پڑھنے والوں پر اس کا اثر کن کن راستوں سے ہوتا ہے؟ ان سب کا علم ضروری ہے۔

صحافت کے مختلف میدان عمل ہوتے ہیں، مثلاً سیاسی میدان۔ اس میں ایڈیٹر یا مقالہ نگار عموماً کسی سیاسی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، اور بہت سے اپنی بات کہتے ہیں، اگر کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہیں۔ تو اس کی حریف جماعت کے خلاف نئے نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی صحافت عام طور پر روزنامہ سہ روزہ اور ہفتہ وار پرچوں کے ذریعہ چلتی ہے۔ دوسرا میدان ثقافتی ہے۔ جس میں مقصد معلومات بہم پہونچانا، خبریں اور ثقافتی امور سے واقف کرانا ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے تربیتی وادبی کام ہے، یہ صحافت عام طور پر ہفت روزہ، اور پندرہ روزہ اور ماہانہ سطح پر کی جاتی ہے۔ تیسرا میدان اصلاحی، اخلاقی ودینی ہے۔ اس میں اصلاح حال اور اخلاق ودین کی طرف مائل کرنا، اور

غلط راستوں سے ہٹانا، اچھے راستوں کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ یہ صحافت بھی عموماً ہفت روزہ، اور ماہانہ ہوتی ہے، اور یہ دعوتی و تربیتی کام ہے، چوتھا میدان کسب معاش اور نفع اندوزی کا ہے۔ اس میں صحافت کو اپنے ذاتی معاش کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ چبھتے ہوئے موضوع کو اختیار کرتی ہے، اور جاذب نظر اور نفس انسانی کو متوجہ کرنے والے موضوعات اور اسلوب کو اختیار کرتی ہے۔ اقتصادی صحافت، یہ پانچواں میدان ہے۔ اس میں مالی انتفاع اور مالی ترقی کے مقصد سے باتوں کو مرتب کیا جاتا ہے، اور مضامین کو ڈھالا جاتا ہے۔ اس میں خیر و شر، سچ جھوٹ، اخلاص و عیاری کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا، بس جس طرح نفع ہو وہ کیا جاتا ہے۔ بہر حال صحافت کا جو بھی میدان ہو اس میں مدیر یا صاحب قلم ایک مخصوص ذہنی مقصد کو لے کے چلتا ہے۔ اور تمام مضامین اور مقالوں کو اسی کے تحت رنگ کر پیش کرتا ہے۔ اور قاری رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے اس کے افکار و تصورات کا ہم نوا بن جاتا ہے۔

لہٰذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم صحافت کے اصول و مزاج کو سمجھیں، اور ان حدود کا تعین کریں جن میں رہ کر ہمیں کام کرنا ہے۔ نیز اپنے اندر اتنی استعداد بھی پیدا کریں کہ اپنی فکر کو تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے طاقتور اور ٹھوس انداز میں پیش کر سکیں۔